دوماہی

فکرِ اسلامی

اشاعتِ خاص

خطیب العصر حضرت مولانا مفتی

شکیل احمد قاسمی سیتاپوری نمبر

بانی

حضرت مولانا محمد باقر حسین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ

مدیر

محمد اسعد قاسمی

مرکز دعوت و ارشاد دارالعلوم الاسلامیہ بستی یوپی، الہند

معمارِ قوم وملت

حضرت اقدس مولانا محمد باقر حسین قاسمی

زندگی کے درخشاں نقوش

ترتیب

محمد اسعد قاسمی   محمد اسجد قاسمی ندوی

مرکز دعوت وارشاد

دار العلوم الاسلامیہ بستی یوپی الہند

علمی ودینی مجلّہ

دوماہی فکر اسلامی بستی

بیاد خطیب العصر حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ

بانی
حضرت مولانا محمد باقر حسین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ

مدیر: محمد اسعد قاسمی
Watsaap No: 9415162702

شمارہ نمبر ——— ۱۵۸-۱۵۹
ستمبر تا دسمبر ۲۰۲۴ء

مجلس ادارت

- مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی
- مولانا مفتی عتیق احمد قاسمی بستوی
- مولانا محمد رفیق قاسمی بستوی
- مولانا ظہیر انوار قاسمی
- مولانا مفتی محمد احمد قاسمی ندوی

زر تعاون
سالانہ 200 روپے

اعزازی
(۲۰ سال کے لئے)
5000 روپے

چیک یا ڈرافٹ بنام
DARUL ULOOM AL- ISLAMIA, BASTI- 272001
A/c No: 1939248881
IFSC Code: CBIN0283265
CENTRAL BANK OF INDIA,
A. P. N. DEGREE COLLEGE, BASTI

کمپوزنگ: تصور حسین قاسمی شعبۂ کمپیوٹر دارالعلوم الاسلامیہ بستی
Mob: 9838456510

معاون تصحیح وطباعت: مولانا محمد افضل حسین قاسمی
Mob: 9918977313

زرتعاون ودیگر امور میں رابطہ کا نمبر
مولانا امتیاز احمد قاسمی Mob: 7355654214

ناشر مرکز دعوت وارشاد دارالعلوم الاسلامیہ بستی، یوپی (الہند)

فہرست عناوین

• ''فکر اسلامی'' کی یہ اشاعتِ خاص ——— مولانا مفتی محمد احمد قاسمی، ندوی	۳
• تعزیتی مکتوب ——— مولانا محمد اسعد قاسمی	۴
• ہندوستان میں فنِ تدریس وخطابت کا نیّرِ اعظم غروب ہوگیا ——— مولانا محمد اسعد قاسمی	۵
• کئی دماغوں کا ایک انساں ——— مولانا محمد اسجد قاسمی، ندوی	۴۸
• ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے ——— مولانا مفتی محمد احمد قاسمی، ندوی	۶۵
• ایک نامور معلم وخطیب ——— مولانا محمد رفیق قاسمی بستوی	۷۲
• یادِ یارِ مہرباں ——— مولانا عبد العلی فاروقی	۷۹
• حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ اور مظاہر علوم وقف سہارنپور ——— مولانا محمد سعیدی	۸۴
• میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا ——— مولانا محمد سالم قاسمی	۸۹
• حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ ——— ڈاکٹر تابش مہدی	۹۴
• دار العلوم دیوبند کے ایک قابلِ فخر فاضل مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ ——— مولانا حکیم محمد ساجد قاسمی	۱۰۰
• اُنہیں ڈھونڈو اب چراغِ رُخِ زیبا لے کر ——— مولانا مفتی محمد یحییٰ قاسمی	۱۰۵
• تدریس وخطابت کے فردِ یگانہ ——— مولانا قاری احمد سعد قاسمی	۱۱۱
• آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ——— مولانا شاہد علی قاسمی	۱۱۴
• آہ! استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ ——— مولانا مفتی سعید الرحمٰن قاسمی	۱۱۶
• ملتِ اسلامیہ کا ایک درخشندہ ستارہ ——— مولانا محمد افضل حسین قاسمی	۱۲۰
• مرثیہ بر سانحۂ ارتحال حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ ——— مولانا حفیظ اللہ قاسمی بستوی	۱۲۴
• مقرر، ایک شعلہ بار تھے مفتی شکیل احمدؒ ——— جناب رہبر پرتاپ گڑھی	۱۲۶
• خطباتِ خطیب العصر حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ: چند نمونے ——— ادارہ	۱۲۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکر و نظر

’’فکر اسلامی‘‘ کی یہ اشاعتِ خاص

از: مولانا مفتی محمد احمد قاسمی، ندوی

احسان کی قدر، محسن شناسی اور اپنے محسنین و مخلصین کو خراج تحسین پیش کرنا اور ان کی خدماتِ جلیلہ کا تذکرہ کرنا، اخلاق حسنہ میں بنیادی مقام و درجہ رکھتا ہے، ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے: "وَاجْعَلْ لِیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِیْ الْآخِرِیْنَ" ’’اور آئندہ آنے والوں میں میرے ذکر کو باقی رکھئے‘‘ (سورۃ الشعراء: ۸۴)

چنانچہ روزِ اول ہی سے مجلّہ ’’فکر اسلامی‘‘ کی مجلسِ ادارت کے رکنِ رکین اور سالہا سال تک اس کے تفسیری کالم ’’معارف الکتاب‘‘ کو زینت بخشنے والے ہمارے استاذِ گرامی قدر حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ان کے ذکرِ حَسَن اور خوبصورت تذکرہ کو زندہ و باقی رکھنے کے لئے مجلّہ ’’فکر اسلامی‘‘ اُن کے حالات و خدمات پر مشتمل ایک اہم دستاویز شائع کر رہا ہے، جس کی ضخامت ۱۸۴ صفحات ہے اور اس میں مدیر مجلّہ حضرت مولانا محمد اسعد قاسمی صاحب دامت برکاتہم ناظم دارالعلوم الاسلامیہ بستی کا سب سے تفصیلی مضمون ہے، دارالعلوم الاسلامیہ میں ان کے قیام اور اس مدت کے سفر و حضر میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ سب سے زیادہ رفاقت ان ہی کے حصہ میں آئی تھی، اس کے علاوہ دیگر اہلِ علم کے بھی گراں قدر، قیمتی مضامین شاملِ اشاعت ہیں۔ ادارہ

اُن تمام اہلِ قلم، اصحابِ فضل وکمال اور احباب ورفقاء کے اس علمی وقلمی تعاون پر بیحد ممنون ومشکور ہے۔

یہ اشاعتِ خاص اخلاف، ورثاء، شاگردوں اور فیض یافتگان کے حلقوں میں حضرت مفتی صاحبؒ کے تذکرے کو زندہ رکھنے اور اُسے ایک دستاویزی شکل دینے کی ادنیٰ کوشش ہے، حضرت مفتی صاحبؒ کی تدریسی زندگی کا سب سے لمبا دورانیہ دار العلوم الاسلامیہ بستی ہی کا رہا، اور دار العلوم بستی کے طلبہ نے آپ کے چشمۂ صافی اور آبِ حیواں سے خوب سیرابی حاصل کی تھی، اس لئے بستی کے اس مجلّہ پر فرض اور قرض دونوں تھا کہ اپنے اس عظیم محسن کے تذکرے کو بقائے دوام عطا کرے۔ ع

نام نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

استاذِ گرامی قدر تدریس وخطابت، زبان وبیان اور شعر وادب کے بے تاج بادشاہ، مرنجاں مرنج اور باغ وبہار شخصیت کے مالک تھے، کبر وتعلّی، علمی پندار وغرور نام کو نہ تھا اور نہ ہی بیجا علمی قابلیت کا اظہار واعلان۔ وسعتِ نظر، فکری آفاقیت، قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ کے بحرِ ناپیدا کنار کی غواصی وغوطہ زنی ہی آپ کا نشانِ امتیاز تھی۔

ہم بارگاہِ الٰہی میں بصمیمِ قلب سپاس گذار ہیں اور دعا گو بھی کہ کریم رب بال بال اُن کی مغفرت فرمائے، اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور اِس اشاعتِ خاص کو شرفِ قبول سے نوازے۔ (آمین)

❀❀❀

تعزیتی مکتوب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دار العلوم الاسلامیۃ بستی یوپی الہند

DARUL ULOOM-AL-ISLAMIA

BASTI - 272001 U.P. INDIA

Ref. No. .... Dated ....

عزیزان شمیم احمد و برادران سلمہم اللہ تعالیٰ

لکھنؤ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے نامور والدِ گرامی ملک کے عظیم خطیب اور ممتاز عالم دین حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ کے سانحۂ ارتحال کی خبر دل ودماغ پر بجلی بن کر گری۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

یہاں فوراً تحفیظ القرآن الکریم کے تمام درجات میں ختم قرآنِ کریم کرا کر حضرت مفتی صاحبؒ کی روح کو ایصالِ ثواب کیا گیا۔ اور دعائے مغفرت کی گئی۔

والدین کا سایہ ہمیشہ باعثِ رحمت وبرکت ہوا کرتا ہے، چند سال پہلے والدہ محترمہ کا انتقال اور اب حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کا سانحہ آپ تمام بھائیوں اور بہنوں کے لئے بڑا صدمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عظیم حادثہ کو برداشت کرنے کی ہمت وطاقت دے۔ (آمین)

حضرت مفتی صاحبؒ دار العلوم الاسلامیہ بستی آنے سے پہلے دار العلوم دیوبند میں ایک لائق فائق اور اپنے ہمعصروں میں سب سے ممتاز استاذ اور ایک مثالی اور منفرد خطیب کی حیثیت سے ۱۰ رسال کے دورانیے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔ وہ تدریس کے علاوہ میدانِ خطابت کے بھی ایسے شہسوار تھے کہ ان کے آگے کسی کا چراغ نہیں جلتا تھا، ان کے لب ولہجہ میں بلا کی کشش اور جاذبیت تھی، وہ جب بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں، بلاشبہ ان کی آواز کانوں میں رَس گھول دیتی تھی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی وجہ سے دار العلوم الاسلامیہ بستی کا حلقۂ تعارف بہت وسیع اور اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا اور اس کی شہرت کو مزید چار چاند لگ گئے، اور صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی اس کی شناخت اور نیک نامی ہوئی۔ اللهم زد فزد.

دورانِ تدریس ہزاروں طلبہ نے ان سے کسبِ فیض کیا اور فارغ التحصیل ہوکر ملک اور بیرون ملک علمی، دینی اور تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے یہ تلامذہ ان کے لئے صدقۂ جاریہ ثابت ہوں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

ہم دار العلوم الاسلامیہ کے تمام طلبہ، اساتذہ اور کارکنان کی طرف سے آپ تمام بھائیوں اور بہنوں ودیگر پسماندگان کی خدمت میں تعزیتِ مسنونہ پیش کرتے ہیں۔

محمد اسعد قاسمی

مدیر مجلہ ''فکر اسلامی'' و ناظم دار العلوم الاسلامیہ بستی

۲۰ رمحرم الحرام ۱۴۴۶ مطابق ۲۷ رجولائی ۲۰۲۴ء

Mob:9415162702

ہندوستان میں
فنِ تدریس وخطابت کا نیرِاعظم غروب ہوگیا

از-مولانا محمد اسعد قاسمی
مدیر مجلہ ''فکراسلامی'' وناظم دارالعلوم الاسلامیہ بستی، یوپی

یہ بڑی روح فرسا اور انتہائی المناک خبر دل ودماغ پر بجلی بن کر گری کہ استاذ الاساتذہ، خطیب العصر حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری نے ایک طویل علالت کے بعد ۱۷ محرم الحرام ۱۴۴۶ھ مطابق ۲۴/جولائی ۲۰۲۴ء منگل-بدھ کی درمیانی شب میں تقریباً ۲/بجے اپنی رہائش گاہ بارودخانہ گولہ گنج لکھنؤ (جس کو انہوں نے اپنا وطن ثانی بنالیا تھا) داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ وَلَہٗ مَا اَعْطٰی وَکُلُّ شَیْئٍ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُسَمًّی۔

شہر لکھنؤ، سیتاپور، تمبور اور بستی وغیرہ کی اہم شخصیات اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں عیش باغ عیدگاہ میں ان کی نماز جنازہ اور اسی کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

اِس عالَم سے روزانہ ہزاروں افراد رخصت ہوتے ہیں لیکن کچھ عبقری، بلند پایہ اور عظیم المرتبت شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ جب وہ اپنی علمی وعملی صلاحیتوں کو دین وعلم کی خدمت میں صرف کرنے کے بعد دُنیا سے رختِ سفر باندھتی ہیں تو لوگوں کو ایک ایسے خلا اور نقصان بلکہ یتیمی کا احساس ہوتا ہے۔جس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اور ایسے رجالِ فکر وعلم کے رخصت ہوجانے کے بعد

کسی شاعر کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے ؎

ذھب الذین یُعاش فی اکنافھم

بقی الذین حیاتُھم لا تنفع

(جو کام کے لوگ تھے اور جن کی زندگیاں بافیض اور بابرکت تھیں اور جن کے علم وعمل سے ایک عالَم مستفیض ومستنیر ہورہا تھا وہ دُنیا سے چلے گئے، اور اب جو لوگ باقی رہ گئے ہیں اُن کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن سے کوئی نفع اور فائدہ پہونچنے والا نہیں ہے)

اِس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اُنہی باکمال اور ممتاز اشخاص میں حضرت مفتی صاحبؒ کا اسمِ گرامی بھی نمایاں طور پر سرِ فہرست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو چھہتر (۷۶) سال کی عمر عزیز عطا فرمائی اور بلاشبہ ان کی علمی وتدریسی خدمات کا دورانیہ نصف صدی سے زائد عرصے کو محیط ہے، انہوں نے ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں تقریباً دس سال تک تدریسی وتقریری خدمات اس طرح انجام دیں کہ وہاں ان کے علم وفضل، ان کی دِل نشیں تفہیم وتشریح اور منفرد اسلوب واندازِ بیان کا طوطی بولتا رہا، اور انہوں نے اپنی ساحرانہ خطابت، طلاقتِ لسانی اور قوتِ حفظ اور دوسری وہبی صلاحیتوں کا بھی لوہا منوالیا۔ خداوند قدوس نے حضرت مفتی صاحبؒ کو قابلیت اور مقبولیت دونوں جوہروں سے خوب مالامال فرمایا تھا اور یہ حقیقتِ واقعہ ہے کہ کئی دماغوں کا ایک انسان صدیوں میں وجود میں آتا ہے۔ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ایسی جامع الکمالات شخصیت کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ایک عالَم اس میں جمع ہوگیا ہے۔

ولیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

(اللہ تعالیٰ کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے کہ وہ ایک عالَم کی خوبیوں اور خصوصیتوں کو فردِ واحد میں جمع کردے)

حضرت مفتی صاحبؒ جیسی عبقری شخصیتیں روز بروز پیدا نہیں ہوتیں، جو ادبی ذوق، مطالعہ کی گہرائی وگیرائی، جو جامعیت اور رسوخِ علمی اور فنون پر قابو یابی، تدریس وتفہیم اور مشکل ترین مباحث

کو انتہائی آسان اسلوب میں طلبہ کے دل ودماغ میں اتار دینے کا جو ملکہ اور جو محیر العقول کرشماتی صلاحیت حق تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی تھی دُنیائے علم وتدریس میں اس کی مثالیں خال خال ہی ملیں گی۔ وہ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کے ماہر اور اداشناس تھے اور دورانِ تدریس وخطابت ان زبانوں کے برمحل جملوں اور اشعار کو ایسی مہارت کے ساتھ استعمال اور فِٹ کرتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا گیا ہو۔

حضرت مفتی صاحبؒ ضلع سیتاپور کے مشہور قصبہ تمبور میں پیدا ہوئے، یہیں مدرسہ ضیاء العلوم میں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی، اس کے بعد انہوں نے مدرسہ نور العلوم بہرائچ میں تعلیم حاصل کی، پھر مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں کچھ دنوں کسب فیض کرنے کے بعد وہ دار العلوم دیوبند چلے گئے، جہاں سے ۱۹۶۹ء میں امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے، اور انہوں نے پورے دورۂ حدیث کے طلبہ میں دوسری پوزیشن حاصل کرنے کے بعد اگلے سال وہیں سے تکمیلِ افتا بھی کیا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے دار العلوم دیوبند کے زمانۂ طالب علمی میں وہاں کے شعبۂ فارسی کے ایک فاضل اور ممتاز استاذ حضرت مولانا رحم الٰہی صاحبؒ سے درس کے علاوہ خارج اوقات میں مثنوی مولانا رومؒ سبقاً سبقاً پڑھی تھی۔

اسی بناء پر مثنوی سے ان کا تعلق عشق کے درجے کو پہونچا ہوا تھا، اس کی خاص خاص عبارتیں، حکایتیں اور اشعار ان کو ازبر تھے، جن کو وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں برموقع بکثرت استعمال کرتے تھے، اور انہوں نے مثنوی مولانا رومؒ کی ایک تلخیص بھی تیار کی تھی۔

اسی طرح امام غزالیؒ کی معرکۃ الآرا کتاب احیاء علوم الدین سے بھی ان کو تعلقِ خاطر تھا، بار بار مطالعہ کرنے کی وجہ سے اس کی بہت سی عبارتیں ان کے حافظہ میں محفوظ ہوگئی تھیں، جن کے حوالے وہ دیا کرتے تھے۔

سیرتِ نبوی پر استاذ عبد الرحمٰن عزامؒ کی شاہکار کتاب ''بطل الابطال'' (جس کا ترجمہ راقم سطور نے ''مثالی سیرت'' کے عنوان سے کیا ہے) حالتِ حضر میں ہمیشہ ان کے سرہانے اور حالتِ سفر میں ان کے بیگ میں رہتی تھی۔

مسدّس مولانا الطاف حسین حالیؒ ان کو پوری حفظ تھی، علامہ اقبالؒ، حضرت اکبر الٰہ آبادیؒ اور حضرت جگر مراد آبادیؒ کے سیکڑوں اشعار ان کی نوکِ زبان تھے جن کو وہ برمحل پڑھا کرتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مدرسہ محمودیہ سروٹ مظفر نگر میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دینے لگے۔ اسی اثناء میں ۱۹۷۲ء میں ان کا تقرر بحیثیت استاذ دارالعلوم دیوبند میں ہوگیا۔ ۹-۸ رسال تک وہاں وہ تدریسی خدمات انجام دیتے رہے کہ ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم کے اجلاس صد سالہ کے بعد جب وہاں قضیۂ نامرضیہ پیش آیا اور وقف دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ تو ڈیڑھ سال تک وہاں تدریس سے وابستہ رہنے کے بعد دارالعلوم حیدرآباد چلے گئے اور وہاں بھی تقریباً دو سال تک درس دیتے رہے، حیدرآباد سے وہ اپنے وطن تمبور منتقل ہوگئے اور اپنی مادرِ علمی مدرسہ ضیاء العلوم کے کارِ اہتمام کو سنبھال لیا، اور چند ہی سالوں میں تعلیمی اور تعمیری دونوں اعتبار سے مدرسہ کو بامِ عروج پر پہنچا دیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے اوصاف وکمالات:

حضرت مفتی صاحبؒ اپنی ذات میں ایک انجمن اور بلبلِ ہزار داستان تھے، اُن کی گل افشانئ گفتار دیکھنے اور سننے سے تعلق رکھتی تھی، وہ طبیعتاً بیحد خلیق، بڑے ہنس مکھ، نہایت خوش اطوار اور خوش اخلاق انسان تھے، اُن کی باتوں میں حلاوت وشیرینی کے علاوہ علمی نکات اور شعر وسخن کی باریکیاں بطور خاص ہوتی تھیں، اُن کی شخصیت میں بڑی محبوبیت، دلکشی اور ادائے دِل نوازی کے ساتھ استغنا، بے غرضی، بے نفسی، تواضع وانکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، انھیں خصوصیات کی وجہ سے لوگوں کے دل بے اختیار اُن کی طرف کھنچتے تھے، وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی کے ساتھ مسکراتے ہوئے ملتے، وہ سدا بہار شخصیت کے مالک تھے، اور بلاشبہ ان کی باغ وبہار شخصیت ہمیشہ اپنی شگفتگی کی مہک اور خوشبو سے ہر محفل کو معطر رکھتی تھی، ہر مجلس میں رونقِ محفل اور شمعِ فروزاں انھیں کی ذاتِ گرامی ہوتی تھی۔ حضرت مفتی صاحبؒ لباس میں کرتے اور پائجامے کے علاوہ ہمیشہ سفر وحضر میں ہر موسم کے لحاظ سے شیروانی زیب تن فرماتے تھے، شیروانی اُن کے جسم پر بہت اچھی معلوم ہوتی

تھی۔ چنانچہ وہ میرے ہمراہ سعودی عرب وغیرہ کے سفر میں بھی شیروانی ہی میں رہا کرتے تھے، ایک بار جدّہ میں مقیم اُن کے تلمیذ رشید مولانا طاہر الاسلام قاسمی نے وہاں ایک مجلس میں ازراہِ تفریح اُن سے عرض کیا کہ حضرت! ماشاء اللہ آپ یہاں بھی مُشَر وَنْ (شیروانی میں) ہیں تو مفتی صاحب بھی ہنس پڑے اور پوری محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

یادش بخیر! حضرت مفتی صاحبؒ سے ہمارے تعارف اور تعلقات کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب ۱۹۷۵ء میں مدرسہ شاہی مراد آباد کے اُس وقت کے ناظم تعلیمات حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم نے طلبہ کی انجمن کے سالانہ جلسہ میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اُن کو مدعو کیا، اور حضرت والد ماجد مولانا محمد باقر حسین نور اللہ مرقدہٗ (جن سے حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کے بہت گہرے اور دوستانہ مراسم تھے) سے فرمایا کہ: میں نے اس جلسہ سے خطاب کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند سے ایک ایسے فاضل اور باکمال اُبھرتے ہوئے نوجوان عالم کو مدعو کیا ہے جس کی تقریر وخطابت کا انداز سارے مقررین سے منفرد اور بالکل جداگانہ ہے، چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ تشریف لائے اور اس جلسہ میں فضیلتِ علم کے موضوع پر بڑی معرکۃ الآرا تقریر فرمائی کہ سارا مجمع عش عش کرنے لگا، ان کی تقریر اور خطابت کا انداز ہی ایسا تھا جس نے سب کے دلوں کو مسحور کرلیا، اور حدیث نبوی: اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا (واقعہ یہ ہے کہ بعض تقریر و بیان میں سحر انگیزی ہوتی ہے) کی صداقت بالکل عیاں ہوگئی۔

دوسرے دن حضرت مفتی صاحبؒ حضرت والد ماجدؒ سے ملاقات کے لئے مدرسہ امدادیہ تشریف لائے تو انہوں نے ان کا بڑا اعزاز واکرام فرمایا، اس لئے کہ جس طرح حضرت والد ماجدؒ دارالعلوم دیوبند کے اپنے دورِ طالب علمی میں اپنے محبوب ومایۂ ناز استاذ حضرت مولانا سید فخر الحسن مراد آبادیؒ کے محبوب شاگرد تھے اسی طرح حضرت مفتی صاحبؒ بھی اپنے طالب علمی کے دوران ان کے محبوب شاگرد رہ چکے تھے۔

چنانچہ ایک بار دارالعلوم الاسلامیہ بستی کی تدریس کے دوران اسلامک فقہ اکیڈمی کے بارہویں سمینار کے موقع پر فقیہ ملت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ تشریف لائے تو حضرت

مفتی صاحبؒ سے ملاقات ہوتے ہی پہلا جملہ یہی فرمایا کہ مفتی صاحب! آپ ہمارے محبوب استاذ (حضرت مولانا سید فخر الحسن مرادآبادیؒ) کے محبوب شاگرد ہیں۔

پھر ان تعلقات میں اضافہ اُس وقت ہوا، جب راقم ۱۹۷۷ء میں حضرت والد ماجدؒ کی معیت میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں داخلہ کے لئے وہاں حاضر ہوا، تو حضرت مفتی صاحبؒ کی دلی خواہش پر قیام وطعام ان کے ساتھ ان کے کمرے افریقہ منزل قدیم میں رہا، داخلہ فارم انہوں نے ہی پُر کیا، پھر امتحان داخلہ، اس میں کامیابی، کمرے کے حصول، کتب خانہ سے کتابوں کی فراہمی اور مطبخ سے اجراء طعام ان سارے مراحل میں قدم قدم پر اُن کا مخلصانہ تعاون شامل رہا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا رہائشی کمرہ ہمارے کمرے کے پاس ہی تھا، پھر چند مہینوں کے بعد ان کو دارالعلوم کے مہمان خانہ کے عقب میں بنے ہوئے فیملی کوارٹرس میں ایک مکان مل گیا تو مفتی صاحب اس میں منتقل ہوگئے اور اُن کے اہل خانہ بھی تمبور سے آکر ان کے ساتھ رہنے لگے، گاہے گاہے حضرت مفتی صاحبؒ اپنے خاص طلبہ کی دعوت کرتے تھے تو میں بھی اُن میں شامل ہوتا تھا۔ اُسی سال کے اخیر میں میری والدہ ماجدہ رحمہا اللہ حضرت والد ماجد رحمہ اللہ کے ہمراہ مجھ سے ملاقات کے لئے دیوبند تشریف لائیں تو ان کا قیام بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے گھر ہی پر رہا اور انہوں نے اور ان کے اہل خانہ نے بڑی خندہ پیشانی اور فراخ دلی کے ساتھ ضیافت ومیزبانی کا فریضہ انجام دیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی وہبی صلاحیتیں اور علمی فضل وکمال دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ، طلبہ اور ارباب حل وعقد کے نزدیک مسلّم تھا، اور ملک میں مختلف تنظیموں اور جمعیتوں کی کانفرنسوں وغیرہ کے مواقع پر دارالعلوم کی طرف سے ترجمانی کے لئے بطور خاص اُنہی کا انتخاب ہوتا تھا، چنانچہ ایک بار نوگڑھ ضلع سدھارتھ نگر (سابق ضلع بستی) میں غالباً ۱۹۷۴ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا انعقاد بڑے تزک واحتشام کے ساتھ عمل میں آیا، دارالعلوم دیوبند کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ نے اس میں شرکت کی اور خطاب فرمایا، دوران خطاب سب سے پہلے انہوں نے اس عظیم الشان کانفرنس کے انعقاد پر ذمہ داران کو مبارک باد پیش کی اور اس کے بعد دورانِ تقریر بطور خاص یہ فرمایا: ''جب ہم امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ وغیرہ کا نام لیتے ہیں تو

ہمارے سینے اور دِل اُن کی عظمت ومحبت سے معمور ہوجاتے ہیں اور ہماری گردنیں ان کے علم وفضل کے سامنے خم ہوجاتی ہیں، ہماری یہ دِلی خواہش ہے کہ جب آپ حضرات کے سامنے ائمہ اربعہ، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے اسماء گرامی آئیں تو آپ کے سینوں اور دِلوں کی بھی یہی کیفیت ہو''۔

اُن کی تقریر کے بعد ایک سناٹا سا چھا گیا، کسی سے اُن کی اس بات کا جواب بن نہ پڑا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے ناشتہ اور کھانے وغیرہ کی میزبانی کرنے والے ایک اہل حدیث عالم (جنہوں نے دارالعلوم دیوبند میں چار سال تعلیم حاصل کرکے وہاں سے سند فضیلت حاصل کی تھی، گویا کہ وہ بھی ''قاسمی'' تھے) نے ناشتہ کے دوران حضرت مفتی صاحب کو چھیڑتے ہوئے کہا کہ حضرت مفتی صاحب! ہدایہ میں تخریج کرخی اور تخریج زیلعی سے کیا مراد ہے؟ تو مفتی صاحبؒ نے اُن سے برجستہ فرمایا کہ: آپ نے دارالعلوم دیوبند میں چار سال تعلیم حاصل کی ہے، یہ سوال تو وہیں پر اپنے استاذِ ھدایہ سے کرنے کا تھا، آپ نے اتنا قیمتی موقع کھودیا، حضرت مفتی صاحبؒ کا یہ مُسکت جواب سن کر وہ بالکل خاموش ہوگئے۔

حلقۂ دارالعلوم دیوبند میں بطور خاص شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کے بعد جوشہرت ومقبولیت اور ہردل عزیزی خطابت وتقریر کے میدان میں محدث عصر حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ اور خطیب العصر حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ کو ملی وہ کسی اور فاضل دارالعلوم دیوبند کے حصہ میں نہ آسکی۔

ہر سال اربابِ انتظام کی طرف سے دارالعلوم دیوبند کے غلہ اسکیم کے جلسوں میں خاص طور پر حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریریں بڑے اہتمام سے کروائی جاتی تھیں، جو بہت مؤثر اور مقبول ہوتی تھیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے رفیق قدیم اور انتہائی مخلص دوست حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈویؒ متعدد درسی کتب کے شارح اور سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے یہ واقعہ مجھے خود سنایا تھا کہ دیوبند کے قریب کسی مدرسہ کے جلسہ میں جو اس کے کتب خانہ کی تعمیر کی تکمیل کے موقع پر ہوا تھا

(مدرسہ کا نام میرے ذہن میں نہیں رہا) اُس جلسہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ اور دار العلوم کے ممتاز اور مایۂ ناز استاذ حضرت مولانا سید فخر الحسن مراد آبادیؒ کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ بھی مدعو تھے، صحیح بخاری کی اہمیت وعظمت پر ان کی تقریر دِل پذیر کے دوران دیکھا گیا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ پر رقت طاری ہوگئی اور وہ رومال سے اپنے آنسو پونچھ رہے تھے۔

اسی موقع پر ایک تفریحی واقعہ بھی یاد آ گیا جو حضرت مفتی صاحبؒ کی زبان سے بارہا سنا، مولانا محمد یحییٰ صاحب مرحوم نے جو حضرت مولانا عبد الحق مدنیؒ کے فرزندِ اکبر اور دار العلوم دیوبند کے سفیر تھے، حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریروں کی بے پناہ مقبولیت اور عوام وخواص میں ان کی ہر دلعزیزی اور محبوبیت دیکھ کر ان سے کہا کہ مفتی صاحبؒ! ماشاء اللہ تقریروں کے سلسلے میں آپ کے اسفار بہت ہوتے ہیں، اگر کہیں کوئی ایسی بیوہ خاتون نگاہ میں آئے جو جوان ہو، قبول صورت ہو، مالدار ہو اور بچوں کا جھمیلا نہ ہو تو میں اس سے نکاحِ ثانی کرسکتا ہوں، تو مفتی صاحبؒ نے ان سے تفریحاً فرمایا کہ اگر ایسی کوئی خاتون ملے گی تو اس سے ہم ہی نہ نکاح کرلیں گے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ دُبئی کے پہلے دعوتی سفر میں جو ہمارا حضرت مفتی صاحبؒ کے ہمراہ ہوا تھا، پیش آیا وہاں کے ہمارے میزبان بھائی مظفر کولاؔ نے اپنے گھر پر عورتوں سے مفتی صاحبؒ کے خطاب کا ایک اہم پروگرام رکھا تھا، پروگرام سے ایک دن پہلے انہوں نے مفتی صاحبؒ سے کہا کہ مفتی صاحب! یہاں عربوں کے معاشرہ میں بڑا کھلا پَن ہے، کہ یہاں شوہر پہلی شادی کے بعد دوسری شادی بآسانی کرلیتا ہے، اس لئے کہ اس کی پہلی بیوی بخوشی اس کی اجازت دے دیتی ہے، لیکن ہمارے ہندوستانی معاشرہ میں عام طور پر عورتیں فراخ دل نہیں ہوتیں بلکہ بہت تنگ دلی کا مظاہرہ کرتی ہیں، اگر شوہر نے کسی اور خاتون سے عقدِ ثانی کرلیا تو وہ قیامت برپا کردیتی ہیں کہ سارے گھر کا امن وسکون غارت ہوجاتا ہے۔ اس لئے میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنی کل کی تقریر میں عورتوں کو نکاح ثانی کی ضرورت واہمیت سے واقف کرائیں اور انہیں اس کی ترغیب دیں کہ وہ اپنے شوہروں کو بخوشی نکاحِ ثانی کی اجازت دے دیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ان کی اس گفتگو کو تفریح پر محمول کرتے ہوئے فرمایا مظفر بھائی! ہم یہ بات خواتین سے ضرور کہہ دیں گے لیکن

کب؟ جب ہمارا سامان بندھ جائے گا، اور ہم ایئر پورٹ جانے کے لئے پا بہ رکاب ہوں گے کہ بس اب چند گھنٹوں کے بعد ہم کو نکلنا ہے تو اس موقع پر آپ ایک دوسرے جلسہ کا اہتمام کریں اُس وقت بیان میں ضرور آپ کی فرمائش پوری کر دیں گے، اور یہ بھی فرمایا کہ آپ ہی تو ہوشیار ہیں میرے بھائی! پہلے بیان کرنے پر آپ کی اہلیہ محترمہ ہم سے ناراض ہو جائیں گی اور ہماری چائے اور کھانا پانی سب بند کر دیں گی، یہ سن کر بھائی مظفر کولاؔ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بات وہیں ختم ہو گئی۔

اپنی مادر علم دارالعلوم دیوبند اور اس کے عظیم المرتبت بانی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ساتھ اُن کا ربط و تعلق اور اُن کی حمایت حمیت کے درجہ کو پہونچی ہوئی تھی، دارالعلوم دیوبند کے ایک قدیم فاضل اور صاحب قلم نے خانوادۂ حضرت حاجی عابد حسینؒ کے کچھ افراد کی شہ پر ایک کتاب لکھ ماری، جس میں حضرت حاجی عابد حسینؒ کو دارالعلوم دیوبند کا اصلی بانی قرار دینے کی سعیٔ نامشکور کی تو حضرت مفتی صاحبؒ کی رگِ قاسمیت پھڑک اٹھی اور انہوں نے اس پر چبھتا ہوا یہ تبصرہ فرمایا: ''وہ دیوبند کے کولمبس بننا چاہتے ہیں، رافضیوں نے جو کام کیا تھا وہی انہوں نے کیا ہے یعنی حضرت جبرئیل امینؑ کو وحی حضرت علیؓ کے پاس لانی تھی مگر وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس لے آئے، یہ تاریخ کو مشکوک بنانے کی ناپاک کوشش ہے، حضرت حاجی عابد حسینؒ کے اخلاص میں کوئی شبہ نہیں اور ان کی خدمات بھی مسلّم ہیں، لیکن حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی فکری آفاقیت ہی کا نام ''دارالعلوم دیوبند'' ہے''۔

اِسی موقع پر مجھے ان کی حمیت ایمانی، غیرتِ دینی اور توحید خالص کے علمبردار ہونے کا ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

جناب سراج حسین صاحب سابق وائس چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی کی دعوت پر لکھنؤ میں عربی فارسی بورڈ کے ملحقہ مدارس کی ایک اہم کانفرنس ان کے نصاب تعلیم کے سلسلہ میں برائے غور و خوض منعقد ہوئی، اس کانفرنس کے مہمان خصوصی حضرت مفتی صاحبؒ ہی تھے، اس میں دیگر مسالک کے علماء (بریلوی اور اہل حدیث) بھی تھے، نصابِ تعلیم میں کون کون سی نئی کتب کس کس مسلک کے علماء کی شامل کی جائیں، اس پر بہت دیر تک بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہا، اخیر میں مفتی صاحبؒ نے

معزز حاضرین کے سامنے اپنا سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: ''نصاب تعلیم میں کون سی کتابیں داخل کی جائیں اس کے بارے میں سب سے بنیادی بات میں یہ عرض کرتا ہوں کہ عقیدۂ توحیدِ خالص کے سلسلے میں کسی سے ہم کوئی کمپرومائز (Compromise) اور مصالحت ہرگز نہیں کریں گے، ہم اُن کتابوں کو قطعاً برداشت وقبول نہیں کریں گے جن میں بعض ایسی مشرکانہ وکفریہ باتیں ہوں جن سے عقیدۂ توحید پر حرف آتا ہو، ہمارا عقیدہ بے غبار توحیدِ خالص کا ہے''۔

ملک کے اہم اداروں کے عربی ترجمانوں کے مدیران کے بارے میں حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک بار مدرسہ افضل المعارف الٰہ آباد کے سالانہ جلسہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ'' آپ اِن سے حضرت خالد بن ولیدؓ بننے کی توقع رکھتے ہیں، یہ ناممکن ہے، اس لئے کہ یہ کبھی عرب حکمرانوں کے غیر اسلامی اقدامات اور حرکتوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے، حالانکہ اسی ملک میں ابھی ساٹھ ستّر سال پہلے ایک عربی مجلہ کے مدیر شہیر کا بے باک، جری اور ایمانی غیرت وحمیت سے لبریز قلم مصر وغیرہ کے حکمرانوں کی عرب قومیت کی تحریک اور فرعونیت وغیرہ کو بڑھاوا دینے کے خلاف شمشیرِ برہنہ تھا''۔

اسی طرح عرب امارات وغیرہ میں مقیم اُن علماء کے بارے میں جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر وہاں کی ملازمت چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں، اور وہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ بھی انجام نہیں دے رہے ہیں، حضرت مفتی صاحبؒ کا موقف دوٹوک اور بالکل واضح تھا، وہ فرماتے تھے کہ اِن جیسے علماء کے بارے میں حضرت امام نوویؒ نے ''شرح صحیح مسلم'' میں حضرت ابوعلی الدقّاقؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ''من سکت عن الحق فھو شیطان اخرس'' (حق سے خاموشی اختیار کرنے والا اور حق بات نہ کہنے والا گونگا شیطان ہے)۔

بلاشبہ وہ علامہ اقبالؒ کے اس شعر کا مکمل مصداق تھے۔ ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضرت مفتی صاحبؒ کی نگاہِ دوررس مدارس، ان کے ذمہ داران، اساتذہ اور طلبہ کے تمام

پہلوؤں پر رہا کرتی تھی۔ایک واقعہ انہوں نے راقم کو حیدرآباد کے اپنے دورانِ قیام کا سنایا۔جب وہ وقف دارالعلوم دیوبند سے دارالعلوم حیدرآباد چلے گئے تھے ’’وہاں کے ایک اہم استاذ کی اہلیہ بہت تیز مزاج تھیں، ان کا پڑوس (فیملی کوارٹرس) کی عورتوں سے روز روز لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا تو میں نے ازراہِ تعلق ان سے کہا کہ آپ ماشاءاللہ آدابِ مدنیت اورتہذیب وشائستگی سے بخوبی واقف ہیں، اپنی اہلیہ محترمہ کوسمجھائیں اس لئے کہ لڑائی جھگڑا کوئی اچھی چیز نہیں ہے اس سے آپ کی تصویر اساتذہ کی نظروں میں خراب ہورہی ہے ورنہ بصورتِ دیگر آپ ادارہ کی رہائشی کالونی کو چھوڑ کر شہر کے کسی محلہ میں رہائش اختیار کریں، میری یہ نصیحت کارگر ہوئی انہوں نے اپنی اہلیہ کوسمجھایا، الحمدللہ پھران کی طرف سے کسی جھگڑے کی نوبت نہیں آئی اورسارے اسٹاف کے لوگ اپنے اہل خانہ کے ساتھ باہم شیروشکر ہوکرسکون واطمینان کیساتھ رہنے لگے‘‘۔

حضرت مفتی صاحبؒ کومختلف مدارس میں طلبہ کے امتحان کے سلسلہ میں بھی مدعو کیا جاتا، چنانچہ انہوں نے ہمیں ایک مدرسہ کے امتحان کا یہ واقعہ سنایا کہ ’’ہم وہاں امتحان لینے کے لئے گئے تو دورانِ امتحان معلوم ہوا کہ طلبہ بہت کمزور ہیں، چنانچہ ہم نے ازراہِ دیانت وامانت اکثر طلبہ کو فیل کردیا، ہمارے جانے کے بعد وہاں کے مہتمم نے تمام فیل شدہ طلبہ کے نمبرات تبدیل کرکے اُن سب کو پاس کردیا، ہم کومعلوم ہواتو ہم نے اُن سے باز پُرس کی تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ آپ تو اپنا کام کرکے چلے گئے اس کے بعد ہم نے اپنا کام کیا، ہم مدرسہ کی کمیٹی کو کیا جواب دیتے؟ وہ امتحان میں اکثر طلبہ کی ناکامی کو اصلاً ہماری ناکامی قرار دیتے ہوئے ہم ہی کو مدرسہ سے نکال دیتے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کوتدریس وخطابت کی اس مقبولیت اور ہردلعزیزی کیساتھ اپنے دل کی دنیا آباد کرنے کی فکر بھی دامن گیر تھی، چنانچہ وہ دارالعلوم دیوبند سے مظاہرعلوم سہارنپور گئے اور وہاں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا شاہ اسعداللہ صاحبؒ ناظم مدرسہ مظاہرعلوم کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوگئے، حضرت ناظم صاحبؒ نے بیعت کرتے وقت اُن سے اُن کے وطن کے بارے میں دریافت فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں سیتاپور کا رہنے والا ہوں، تو حضرت ناظم صاحبؒ نے ازراہِ ظرافت اُن سے فرمایا کہ میں رامپور کا ہوں ان شاءاللہ ہم

دونوں کا نباہ ہوجائے گا۔

حضرت مفتی صاحب کی تدریسی زندگی کا ایک اہم باب

دارالعلوم الاسلامیہ بستی:

دارالعلوم الاسلامیہ بستی کو علم و ہنر کے بامِ عروج پر پہنچانے کے سلسلے میں جید الاستعداد اساتذۂ کرام کے انتخاب اور تقرر کے تعلق سے حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی عقابی نظر اور نگاہِ جوہر شناس ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو میں رہا کرتی تھی۔ چنانچہ راقم سطور سے ایک دن فرمانے لگے کہ: مفتی شکیل احمد صاحب آج کل اپنے وطن میں ہیں اور اپنے قصبہ ''تمبور''، ضلع سیتاپور کے مدرسہ ضیاء العلوم کے ذمہ دار ہیں، تم ان سے دارالعلوم الاسلامیہ میں تدریس کے لئے بات کرو، تو اس سلسلے میں میں نے ان سے متعدد بار گفتگو کی، تو انہوں نے ہر بار یہی کہا کہ آپ کا یہ مرکزی ادارہ بستی میں ہے، جو لکھنؤ سے دور ہے، اس ادارے کو لکھنؤ جیسے بڑے اور اہم شہر میں ہونا چاہئے تھا تو میرے لئے بھی اس میں خدمتِ تدریس انجام دینے میں بڑی آسانی ہوتی، اس کے بعد میں نے حضرت والد ماجدؒ کے ایماء پر ان کو طلبہ کی انجمن ''اصلاح البیان'' کے سالانہ اجلاس میں تشریف آوری کی دعوت دی، وہ بسواں، ضلع سیتاپور کے مشہور معالج اور داعی ڈاکٹر توکل حسین صاحبؒ (جو تبلیغی جماعت کے ذمہ داروں میں ایک اہم شخصیت کے مالک تھے) کے ہمراہ تشریف لائے، اور اپنے سہ روزہ قیام میں طلبہ کے پروگرام میں شرکت اور خطاب کے علاوہ شہر کے ایک تبلیغی اجتماع میں بھی ان کی بڑی شاندار تقریر ہوئی، وہ دارالعلوم الاسلامیہ کے علمی ماحول اور کتب خانہ کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔

مفتی صاحبؒ کے اہل وعیال لکھنؤ میں قیام پذیر تھے، وہ ان کی وجہ سے ہر ہفتہ کے اخیر میں تمبور سے لکھنؤ آجاتے تھے، میں نے لکھنؤ جا کر اُن سے یہاں کی تدریس کے سلسلے میں گفتگو کی، تو وہ نیم راضی ہوگئے، اور بعجلت ممکنہ بستی آنے کا وعدہ فرمایا، حسب وعدہ یہاں وہ تشریف لائے اور اُن سے سارے امور بحسن وخوبی طے ہوگئے، یہ یکم ربیع الاول ۱۴۱۶ھ مطابق ۳۰؍ جولائی ۱۹۹۵ء کی بات ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے یہاں تدریس پر آمادہ اور تیار ہونے میں دارالعلوم الاسلامیہ کے محرکِ

اول اور سرپرست عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعائے نیم شبی، توجہ خصوصی اور ان کا مخلصانہ مشورہ بھی شامل تھا۔

اسی سال ہمارے یہاں سال ہفتم (مشکاۃ المصابیح وغیرہ) کا درجہ نیا نیا قائم ہوا تھا، ہفتہ عشرہ کے بعد حضرت مفتی صاحب نے اپنے متعلقہ اسباق (مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر بیضاوی، ہدایہ جلد ثالث، مختصر المعانی اور دیوان متنبی وغیرہ) پابندی اور مستعدی کے ساتھ پڑھانے شروع کر دیئے، ان کی یہاں آمد سے اساتذہ اور طلبہ بہت خوش ہوئے اور ان میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا، گویا اس چمنستانِ علم میں تازہ بہار آ گئی۔

یہاں سے پہلے مفتی صاحبؒ دار العلوم دیوبند میں ایک لائق فائق اور اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز استاذ اور ایک مثالی اور منفرد خطیب کی حیثیت سے تقریباً دس سال کے عرصہ میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے، مفتی صاحب تدریس کے علاوہ میدانِ خطابت کے بھی ایسے شہ سوار تھے کہ اُن کے آگے کسی کا چراغ نہیں جلتا تھا، اُن کے لب و لہجہ میں بلا کی کشش اور جاذبیت تھی، وہ جب بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اُن کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں، بلا شبہ ان کی آواز کانوں میں رَس گھول دیتی تھی۔

مفتی صاحبؒ کی وجہ سے دار العلوم الاسلامیہ کا حلقۂ تعارف بہت وسیع اور اس کی مقبولیت میں بڑا اضافہ ہوا اور اس کی شہرت کو مزید چار چاند لگ گئے، اور صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی اس کی شناخت اور نیک نامی ہوئی، اللھم زد فزد۔

دار العلوم الاسلامیہ جیسا کہ اکثر قارئین کرام جانتے ہیں کہ اس کو ہمارے والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین قاسمی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے اکابر اہل اللہ اور اصحابِ فکر و نظر کے مشورہ سے قائم فرما کر اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا، اور اپنی پوری توانائی و طاقت اس کی نشو و نما اور اس کو پروان چڑھانے میں صرف کر دی، اور علم و فن کے اعلیٰ درجے کے دماغ یہاں جمع کر دیئے۔ اُن کا لگایا ہوا یہ پودا اُن ہی کے سامنے تناور درخت بنا اور برگ و بار لایا، اس کے پھول و پھل پوری دُنیا میں اور خاص طور پر ہندوستان کے ہر خطے میں اپنی چمک دَمک اور روشنی بکھیر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تا قیامِ قیامت

اس کے فیوض اور انوار و برکات کو قبولیت کے ساتھ جاری و ساری رکھے اور تسلسل کے انقطاع کے بغیر اس ادارے کو اپنے شاندار اور درخشاں ماضی کی طرف لوٹائے۔ آمین

بات حضرت مفتی صاحبؒ کی بحیثیت استاذِ تفسیر وحدیث دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں تشریف لانے کی چل رہی تھی، حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے تدریسی دورانیے میں سب سے لمبا وقت بہت ہی سکون اور اطمینان کے ساتھ (۱۱ ؍سال) یہاں گذارا۔ دارالعلوم الاسلامیہ کا ماحول، یہاں کے ذمہ داران اور اساتذہ کی محنتوں اور کوششوں سے خالص علمی تھا، اس ماحول میں مفتی صاحب کی آمد ایک مژدۂ جاں فزا سے کم نہ تھی، اُن کے علمی جوہر یہاں خوب کھلے، انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، بلاغت، ادب اور دیگر علوم وفنون کی تدریس میں مہارتِ تامہ اور اپنے امام فن ہونے کا مکمل ثبوت فراہم کیا۔ اور بلا مبالغہ سیکڑوں طلبہ اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے اپنے دامن میں علم وفن کے لعل وگہر لے کر رخصت ہوئے، اور اِس وقت ملک کے بہت سے اہم اداروں میں علم دین اور اس کے نشر واشاعت کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔

یہ تو ذکر تھا مفتی صاحب کے تدریسی فضل وکمال کا۔ اب ان کی ساحرانہ خطابت کا بھی کچھ تذکرہ پڑھتے چلئے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریر وخطابت کے سب سے بڑے مداح اور قدردان اور ان کی تشجیع اور حوصلہ افزائی فرمانے والے ممتاز عالم دین اور مشہور بزرگ عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ کا قیمتی تاثر حضرت مفتی صاحب کی تقریری کتاب: ’’دیکھنا تقریر کی لذت‘‘... جلد اول میں تقریظ کی شکل میں موجود ہے، حضرت قاری صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

’’اِس وقت میرے سامنے تقریروں کا جو مسودہ ہے، اس میں دعوت بھی ہے، اصلاح بھی ہے، تبلیغ بھی ہے اور سحر انگیزی بھی ہے، اللہ تعالیٰ کے کتنے بندے اِن تقریروں سے راہِ راست پر آگئے اور انہیں بہترین ذخیرۂ معلومات حاصل ہوگیا، یہ میرے عزیز بھائی اور مخلص رفیق مولانا مفتی شکیل احمد صاحب سیتاپوری کی تقریروں کا مجموعہ ہے، اِن تقریروں کی دِلپذیری اور خطاب کی سحر انگیزی کو بیان کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، موصوف ایک باصلاحیت صالح نوجوان اور عالم باعمل اور مؤثر اور دل میں اُتر جانے والی تقریروں سے

دعوت واصلاح کی خدمات انجام دے رہے ہیں، نیز مفتی صاحب دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں استاذ تفسیر وحدیث بھی ہیں، میں اُن سے اور ان کی تقریروں سے واقف بھی ہوں اور متأثر بھی۔

اِن تقریروں میں زورِ بیان اور دعوتِ نبویؐ کی روح جلوہ گر ہے،.....اِن تقریروں میں مفتی صاحب دعوتِ اسلامی، فکر نبوی، اور فن تقریر سے پورے طور پر واقف اور حامل نظر آتے ہیں، اُنہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کی امت اور شریعت سے جذباتی تعلق بھی ہے اور اُن کا دلِ عشقِ الٰہی اور محبتِ نبوی سے لبریز بھی ہے، جس سے ان تقریروں کی تاثیر اور افادیت بڑھ گئی ہے''۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی یہ کتاب دو جلدوں میں متعدد بار دارالعلوم الاسلامیہ کے مرکز دعوت وارشاد سے بڑی خوبصورت کتابت اور عمدہ طباعت کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوکر مقبولِ خاص وعام ہوچکی ہے، اِس کتاب کا انتساب مفتی صاحبؒ کے قلم سے ملاحظہ ہو:

''عالم ربانی حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی کے نام جن کے ایماء پر یہ تقریریں جمع کی گئیں اور مشرقی یوپی کے شہرۂ آفاق مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے نام جس کی علم پرور اور پُرسکون فضاؤں میں یہ تالیف پایۂ تکمیل کو پہنچی''۔

حضرت مفتی صاحبؒ اپنی اس کتاب دلپذیر کے''حرفِ آغاز''میں تحریر فرماتے ہیں:

''خطابت وتقریر میں روایت ودرایت بھی ہے اور اس میں جذبات وتأثرات بھی ہیں۔

مقرر کو اپنی تقریر میں علومِ معقولہ ومنقولہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے، اور اس کو اپنے جذبات وتأثرات سے بھی کام لینا پڑتا ہے، یہاں علوم اور جذبات لازم وملزوم ہیں، لیکن اس فن پر چھاپ، جذبات وتأثرات ہی کی ہے، جذباتِ عشق کے بغیر علم اور استدلال کا رنگ بالکل پھیکا رہتا ہے، جذبات سے عاری انسان مقرر نہیں ہوسکتا ؎

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

جو شخص اس کوچہ میں قدم رکھنا چاہتا ہے، وہ پہلے نبیِ اُمّی فداہ ابی واُمّی اور آپ ﷺ کی امت وشریعت سے جذباتی تعلق قائم کرے، اور ان کے عشق سے دل کی دیگ کو دہکائے، اور اُن کی یاد میں اَشک بہائے، اس کے بعد امید کی جاسکتی ہے، کہ اِن آنسوؤں اور آہوں میں اثر پیدا ہو۔

ایسی آنکھ اور ایسا دل رکھنے والے درویش ہی امتِ خوابیدہ کو بیدار کرسکتے ہیں، یہ نہ خود سوئیں گے، نہ کسی کو سونے دیں گے ؎

اس سے طوفان اٹھا ، اُس نے گرائی بجلی
چشم نے، آہ شرر بار نے سونے نہ دیا

جب دین وشریعت، ایمان واسلام، قرآن وحدیث حق ہیں، اور جو چیز ان کے منافی ہے وہ باطل ہے، اور جب ہماری زندگی اور ہماری صحت اللہ تعالیٰ کی امانت اور دین کی ملکیت ہے، تو پھر زندگی اور صحت کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہوسکتا ہے کہ اسی دینِ برحق کی اشاعت کیلئے اس زندگی اور صحت کو صرف کردیا جائے۔

ہمارا دل ودماغ، ہماری زبان وبیان، ہمارے وسائل واسالیب، دینِ برحق کی توضیح وتشریح کیلئے وقف ہوجائیں، اور اس کی برتری وبالا دَستی کو ثابت کرنے میں کام آجائیں، اس سے بڑھ کر سعادت کیا ہوسکتی ہے؟ ؎

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
اُن کی زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

کفر والحاد دَندَنا رہا ہے، اور ایمان واسلام کونے میں دَبا بیٹھا ہے، حق وصداقت کی یہ مظلومی و بے کسی دیکھ کر جس قدر دل کڑھتا ہے اسی قدر دل کے سوتے پھوٹتے ہیں، اور زبان کا چشمہ جاری ہوجاتا ہے۔

تقریریں کیا ہیں؟ مقرر کا خونِ جگر، اس کے دل کی کڑھن اور اس کے بے تاب نالے ہیں ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ ، کہ صاحب ہم نے
خونِ دل کتنا کیا جمع تو دیوان کیا

آج سے کوئی بیس سال پہلے ناچیز کی بعض تقریریں ’’گوہرِ علم جوہرِ سیرت‘‘ کے نام سے دیو بند سے شائع ہوئی تھیں، جو بہت مقبول ہوئیں، اس لئے مزید تقریریں شائع کرنے کا تقاضا کیا گیا، مگر ان تقاضوں سے طبیعت میں کوئی داعیہ اور تحریک نہیں پیدا ہوئی، لیکن جب درویشِ خدامست حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی دامت برکاتہم نے حکم دیا کہ اپنی تقریریں ٹیپ کرواکر شائع کرو، اور ازراہِ الطافِ خسروانہ ٹیپ ریکارڈر کی قیمت بھی اپنی جیبِ خاص سے باصرار عنایت فرمائی، تو پھر مزید تاخیر کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی، چنانچہ حضرت کا ادنیٰ خادم ہونے کی حیثیت سے مجھ سے جو ہوسکا ہے اس کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں ؎

گو نالہ نارسا ہو، نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہوسکا‘‘

شکیل احمد

۱۱؍جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ، بروز دوشنبہ

خطابت وتقریر کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحبؒ کی یہ قیمتی تحریر بھی پڑھئے۔

انسانی فطرت جس طرح مشاہد ومناظر سے متاثر ہوتی ہے اسی طرح کلمات واصوات سے بھی، جو مناظر ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں وہ ہماری طبیعت بلکہ ہمارے افکار وخیالات پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح جو الفاظ اور جو آوازیں ہماری قوتِ سامعہ اور ہمارے کانوں سے گذرتی ہیں اُن کا ہماری طبیعت اور ہمارے دل ودماغ پر اثر ہوتا ہے۔

شاعرانہ زبان میں کہا جائے تو حیوانات اور جمادات پر بھی الفاظ کا جادو چلتا ہے۔ فراق کے مارے ہوئے کے دردانگیز نالے بلبلوں کو غزل خواں بنادیتے ہیں، چنانچہ مرزا غالبؔ کے نالہ وفریاد میں یہی تاثیر تھی، فرماتے ہیں ؎

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر میرا نالہ غزل خواں ہوگئیں

محبوب کے مسکرانے سے کلیوں میں جان پڑ جاتی ہے، اور اس کی لب کشائی سے پورا چمن گلزار

ہوجاتا ہے، اور مُرجھائے ہوئے پھول کھِل جاتے ہیں ؎

یوں مسکرائے کہ جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنادیا"

مجلہ "فکر اسلامی" کا اجراء

۱۹۹۵ء میں دارالعلوم الاسلامیہ کے مرکز دعوت وارشاد کی طرف سے مجلہ "فکر اسلامی" کا اجراء عمل میں لایا گیا، تو حضرت مفتی صاحبؒ روزِ اول ہی سے تاحین حیات اس کی مجلس ادارت کے ایک مؤقر رکن رہے، اور یہاں کی اپنی پوری تدریسی زندگی میں "معارف الکتاب" کے نام سے تفسیر کا کالم وہی لکھتے تھے۔ چنانچہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر بڑی تفصیل اور دیدہ ریزی سے تحریر کرنے کے بعد انہوں نے سورۂ بقرہ کی تفسیر کا بھی اچھا خاصا حصہ پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا تھا، ان کا یہ مضمون اہل علم قارئین کے حلقوں میں بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور شوق کی آنکھوں سے پڑھا جاتا تھا، اس مستقل کالم کے علاوہ ان کے اور بھی متعدد مضامین اس رسالے میں شائع ہوئے، خاص طور پر اس کے خاص نمبرات: صدیق نمبر، مفکر اسلام نمبر، معاصر فقہ اسلامی نمبر، فقیہ ملت نمبر میں ان کے مضامین قابل دید ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریر وخطابت کے چند شہ پارے

خالص لکھنوی زبان، پرجوش اندازِ خطابت اور دورانِ تقریر اردو، عربی اور فارسی کے برمحل اشعار ان کی تقریروں کو انتہائی مؤثر اور طاقتور بنادیتے تھے کہ سامعین پر ایک سحر کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی، کوئی چھوٹے سے چھوٹا جلسہ ہو یا بڑا اجلاس، اس کو کامیابیوں سے ہمکنار کرنے کیلئے تنہا ان کی تقریر ہی کافی ہوتی تھی۔

مفتی صاحبؒ کی سحر انگیز خطابت کے یہ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

اصحابِ کہف کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحبؒ نے بیان فرمایا: اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى، وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ

دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا۔ (سورہ کہف)

’’یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں خوب ترقی دی تھی، اور ہم نے ان کے دل خوب مضبوط کردیئے تھے، یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب کہ وہ (دین میں) پختہ ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، ہم اس کے سوا کسی معبود کو ہرگز نہیں پکاریں گے، اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم یقیناً انتہائی لغو بات کہیں گے‘‘۔

یہ ہے اصحابِ کہف کا ایمان ویقین اور ان کی عقیدۂ توحید میں پختگی اور استقامت کہ ہم عقیدۂ توحید کے سلسلہ میں کسی سے کوئی مصالحت نہیں کریں گے، چاہے ہمیں کتنی ہی آزمائشوں اور آگ اور خون کے دریا ہی سے کیوں نہ گذرنا پڑے‘‘۔

اور اللہ تعالیٰ کے عظیم المرتبت پیغمبر حضرت یوسف علیہ السلام کے کردار کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

’’اصل چیز ہے سیرت وکردار‘‘ حضرت یوسف علیہ السلام کا کردار ملاحظہ کیجئے۔ زلیخا نے دعوتِ گناہ دی، تو حضرت یوسفؑ نے کیا جواب دیا:

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ۔قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ۔اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (سورۂ یوسف)

’’اور جس عورت کے گھر میں وہ رہتے تھے اُس نے ان کو ورغلانے کی کوشش کی اور سارے دروازوں کو بند کردیا، اور کہنے لگی کہ آ بھی جاؤ، یوسف نے کہا اللہ کی پناہ وہ میرا آقا ہے، اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے، سچی بات یہ ہے کہ جو لوگ ظلم کرتے ہیں اُنہیں فلاح وکامیابی حاصل نہیں ہوتی‘‘۔

’’اگر حضرت یوسفؑ کی طہارت وکردار کا یہ جزء سورۂ یوسف میں نہ ہوتا تو سورۂ یوسف میں وہ بات پیدا نہ ہوتی جو طہارت اور کردارِ یوسف کے واقعہ کے شامل ہونے سے پیدا ہوئی، زلیخا اور زنانِ مصر کے دعوتِ گناہ کے جواب میں حضرت یوسفؑ بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں: رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ۔ ’’اے میرے پروردگار! یہ عورتیں مجھے جس کام کی دعوت دے رہی ہیں اس کے مقابلے میں قید خانہ مجھے زیادہ عزیز ومحبوب ہے‘‘۔

ان کا کردار کیا ہے؟ کہ اے میرے رب! معصیت ہم نہیں کریں گے چاہے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہم کو جانا پڑے، چاہے جتنے سامانِ عیش وعشرت ہوں اور چاہے جتنی چیزیں خواہشات کی دعوت دیں، چاہے ہمیں کوئی بھی قربانی دینی پڑے، ہم گناہ کے قریب نہیں جائیں گے۔

حضرت یوسفؑ جیل چلے گئے، اور کئی سال رہے، اس کردار کا انہیں کیا انعام ملا؟ غور فرمایئے مصر میں سب سے زیادہ حضرت یوسفؑ کے حالات ناموافق تھے، غلام بنا لئے گئے تھے، پردیسی تھے، بادشاہی حرم پر دست اندازی کا الزام تھا، سب سے زیادہ مستقبل اُن کا تاریک تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت کے کرشمے نے یہ ثابت کر دکھایا کہ جیسے زلیخا کی کوٹھری سے لے کر تختِ شاہی تک صرف دو قدم کا فاصلہ ہے، ایک قدم زلیخا کی کوٹھری سے اٹھا کر جیل میں رکھا، اور دوسرا قدم جیل سے اٹھا کر تخت شاہی پر رکھ دیا، یہ ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت: وَلَاتَيْأَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللهِ اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ۔ (سورہ یوسف)

”تم لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، واقعہ یہ ہے کہ کافر لوگ ہی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں“۔

یہ ہے دنیا ہی میں سیرت وکردار کی پختگی کا نقد انعام اور صلہ“۔

ایک موقع پر گورکھپور کے اسلامیہ کالج میں منعقد ہونے والے ایک اہم اجلاس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے تعارف کی ذمہ داری راقم کے سپرد کی گئی تو میں نے ان کی منفرد خطابت اور ان کے علمی فضل وکمال کا تعارف کراتے ہوئے اخیر میں جب یہ شعر پڑھا ؎

بس رہا ہے میری آنکھوں میں وہی جانِ بہار
جس کا ہم رنگ کوئی پھول گلستاں میں نہیں

تو سارا مجمع ان کی تقریر سننے کیلئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

فقیہ ملت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے انتقال پُرملال پر ”المعھد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء“ پھلواری شریف پٹنہ (بہار) کے ہال میں منعقد ہونے والے ایک جلسۂ تعزیت میں ان کے خطاب کے یہ جملے ملاحظہ ہوں

وہ فرماتے ہیں: ”میں نے مسندِ تقریر پر بیٹھتے ہی حضرت قاضی صاحبؒ کی روح کو اس شعر سے خراجِ عقیدت پیش کیا ؎

کون مست گیا روٹھ کے میخانے سے
مئے اُڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

اس کے بعد جذبات اُمڈ آئے، اور حضرت قاضی صاحبؒ کو جیسا کچھ میں نے سمجھا تھا اس پر روشنی ڈالتا رہا۔

آخر میں میں نے المعہد العالی کے طلبہ کو مخاطب کر کے کہا حضرت امام ابو یوسفؒ کا قول ہے اَلْعِلْمُ یَحْصُلُ بِذُلٍّ لَا عِزَّفِیْهِ وَیُعْطِیْ عِزًّا لَا ذُلَّ فِیْهِ ”علم ایسی ذلت سے حاصل ہوتا ہے جس میں کوئی عزت نہیں ہوتی، پھر علم ایسی عزت عطا کرتا ہے جس میں کوئی ذلت نہیں ہوتی“۔

میں نے کہا: حاضرین کرام! حضرت قاضی صاحبؒ اس مقولہ کی تازہ مثال تھے، جب اُن کا جنازہ یہاں کی فضا میں ہوائی جہاز سے گذر رہا تھا جس کے استقبال کیلئے وزیر اعلیٰ اور دیگر عمائدینِ سلطنت چشم براہ کھڑے تھے، تو وہ علم کی بالا دستی اور علم کی توقیر واعزاز کا اعلان کر رہا تھا، وہ عزت جو علم وفضل کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔

قاضی صاحبؒ کی زندگی اُن لوگوں کیلئے بھی نمونہ ہے جو ذہین اور باصلاحیت تو ہیں لیکن بے سروسامانی کا شکار ہیں، غربت زدہ ہیں، قاضی صاحبؒ کی زندگی سے ان کو سبق لینا چاہئے، اور اپنے حوصلوں کو بلند کرنا چاہئے کہ ایک غریب خاندان سے اٹھنے والا شخص محض اپنی ذاتی محنت سے اپنی زندگی میں اور مرنے کے بعد کتنی بلندی تک پہونچا، سچ ہے ؎

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر وغنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

(سہ ماہی فکر اسلامی فقیہ ملت حضرت مولانا قاری مجاہد الاسلام قاسمیؒ نمبر ص:۱۰۹)

حضرت مفتی صاحب کی خطابت وتقریر کا پورے ملک میں طوطی بولتا تھا، اُن کے منفرد لب ولہجہ میں بلا کی کشش اور جاذبیت تھی، اور جب وہ دورانِ تقریر قرآن کریم کی آیات اپنے خاص انداز سے پڑھتے اور ان کی دل نشیں تشریح کرتے تھے تو سامعین کے دلوں کی عجب کیفیت ہوتی تھی، اور

احادیثِ نبویہ کی قراءت، اُن کی عمدہ توضیح اور اُس کے ضمن میں صحابہ کرامؓ وغیرہ کے روح پرور واقعات بیان کرنے کے دوران اُن کا لہجہ اور اندازِ بیان ایسا شیریں ہوتا کہ بے ساختہ میر انیس لکھنوی کا یہ مصرعہ زبانوں پر آجاتا کہ ع

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دنیا کے کسی گوشہ میں اگر مسلمانوں کے کوئی کانٹا بھی چُبھ جائے، کہیں ظلم وستم کا بازار گرم ہو تو اُن کا درد اور چوٹ بھی حضرت مفتی صاحبؒ اپنے سینے اور دل پر محسوس کرتے، اور برملا اضطراب و بے چینی کا اظہار بھی کرتے، اور ان کے حق میں اہتمام سے دعائے خیر کا بھی اہتمام کرتے تھے، گویا ان کا عمل اس شعر کے مطابق تھا ؎

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس باب میں ان کا مسلک اُن لوگوں کے مسلک سے بالکل برعکس تھا، جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو بس اپنی ہی فکر کافی ہے، دوسروں کے فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

اداروں اور اس کے ذمہ داروں کیساتھ وفاداری

حضرت مفتی صاحبؒ کے ایمان وعقیدہ کا ایک اہم جُز وفاداری بھی تھا ع

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے

وہ فرماتے تھے کہ جس ادارے میں رہو اس کے اربابِ حل وعقد اور ذمہ داروں کے وفادار بن کر رہو، چنانچہ وہ دارالعلوم دیوبند کے سربراہِ اعلیٰ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کے خلاف کوئی ناروا جملہ سننا بھی گوارہ نہ کرتے تھے، اوران سے حضرت مفتی صاحبؒ کا تعلق عشق کے

درجے کو پہونچا ہوا تھا، اسی وجہ سے وہ وقف دارالعلوم کے قیام کے بعد ہی سے اس سے وابستہ ہو گئے تھے، وہ فرماتے تھے کہ ’’حضرت حکیم الاسلامؒ تاریخ دارالعلوم دیوبند میں سب سے طویل عرصے تک اس کے باوقار منصبِ اہتمام پر فائز رہے، اور ان کا ساٹھ سالہ دورِ اہتمام دارالعلوم کا ’’عہدِ زرّیں‘‘ کہا جاتا ہے۔ اور بلاشبہ وہ ملتِ اسلامیہ کی عظمت کا نشان تھے‘‘۔

اور وہ حلقۂ دیوبند کی سب سے پہلی عالمی شخصیت تھے جنہوں نے ساری دنیا میں دارالعلوم دیوبند کا تعارف کرایا، اور ان کے خطبات وتقاریر کے بارے میں ملک وبیرون ملک کے ممتاز علماء وفضلاء اور نامور اصحابِ قلم کے علاوہ دیوبند کے ایک ممتاز اور منفرد صاحبِ قلم عالمِ دین اور مشہور ومعروف بلند پایہ شاعر مولانا عامر عثمانیؒ نے لکھا ہے کہ ’’منھ سے پھول جھڑنا ایک محاورہ ہے اور یہ محاورہ اگر مجسم شکل میں دیکھنا ہو تو حضرت حکیم الاسلامؒ کی خطابت اور تقریر کو دیکھ لیجئے، اتنی آسان اور عام فہم کوثر وتسنیم میں دُھلی ہوئی زبان کہ ہر سننے والے خاص وعام کے دل میں فوراً اُتر جائے‘‘۔

خطبات کی طرح ان کی تحریریں بھی انتہائی پُرمغز، حکیمانہ اور مدلل ہوا کرتی تھیں، ۲۷ اور ۲۸ ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو ممبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن کے عنوان سے مسلمانوں کا ایک عظیم الشان اجتماع حضرت حکیم الاسلامؒ کی صدارت میں ہوا تھا، اس میں انہوں نے جو خطبۂ صدارت پیش کیا تھا، اس کے بارے میں مولانا عامر عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ

’’فخر الاماثل حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا خطبۂ صدارت تو اس کنونشن کی جان کہئے، مولانا موصوف بلیغ علمی نکات تو ہمیشہ ہی اپنی تحریر وتقریر میں موتیوں کی طرح پروتے ہیں، لیکن اس خطبۂ صدارت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اسلوبِ تحریر میں جوانی بول رہی ہے، یہ کون نہیں جانتا کہ وہ کافی سن رسیدہ ہیں، مگر سن رسیدگی کا تعلق جسم ہی سے ہوتا ہے، انسان کے داخلی اور باطنی وجود سے نہیں، ایمان اگر واقعی ایمان ہو تو بندۂ مومن کا آہنگ آخری ہچکی تک جوان ہی رہے گا، خوشامد یا مبالغہ مت سمجھئے، حضرت ممدوح نے اپنے خطبے میں جن تیوروں کا اظہار کیا ہے، وہ واقعی ایسے ہی ہیں کہ ؏

جی چاہتا ہے ہدیۂ جاں پیش کیجئے‘‘

حضرت مفتی صاحبؒ کا جذبۂ جہاد

حضرت مفتی صاحبؒ کے دل میں جہاد کا جذبہ بھی ہمیشہ موجزن رہتا تھا، وہ جذبۂ جہاد سے سرشار تھے، اور دنیا کے تمام مجاہدینِ اسلام کیلئے ہمیشہ دل سے دعا گو رہتے تھے، دُبئی کے ایک دعوتی سفر کے دوران جو میرے ہمراہ ہوا تھا وہاں کے بڑے مشہور، دیندار اور مخیر تاجر محترم الحاج عبدالرزاق الرصاصیؒ (جو دنیا بھر کے تمام مدارس، مساجد اور رفاہی اداروں کی دل کھول کر امداد کیا کرتے تھے) سے ملاقات اور گفتگو کے دوران مفتی صاحب نے اُن سے فرمایا کہ حاجی صاحب! ''آپ مدارس کا تعاون تو کرتے ہی رہتے ہیں، مجاہدینِ فلسطین وافغانستان وغیرہ کا بطور خاص خیال رکھئے، یہ دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کیلئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور میرے نزدیک ان کا درجہ اور مقام سب سے افضل ہے''۔ تو حاجی صاحبؒ نے ان کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ مفتی صاحب! میں الحمد للہ ان کا خاص خیال رکھتا ہوں، ان کی عظمت میرے دل میں ہے۔

اور ایک مرتبہ دہلی میں چند ایسے حضرات سے مفتی صاحبؒ کی گفتگو ہو رہی تھی جو ائمۂ حرمین شریفین کے بڑے مناقب وفضائل بیان کر رہے تھے اور اُن کے مقابلے میں مجاہدینِ افغانستان (طالبان) کی مذمت اور تحقیر کر رہے تھے، تو حضرت مفتی صاحبؒ کا جذبۂ ایمانی جوش میں آ گیا اور انہوں نے فرمایا کہ مجاہدینِ افغانستان (جو ہر وقت خاروں کی سیج پر ہیں اور اپنا سر ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں اور ان میں کا ہر فرد اپنی ذات میں ایک شخصیت کا نام نہیں، بلکہ ایک عقیدہ اور ایک عمل اور ایک کردار کا نام ہے) کا آپ اُن ائمۂ حرمین سے تقابل کرتے ہیں، جو وہاں پھولوں کی سیج پر دادِ عیش دیتے ہوئے بادشاہ اور ان کے ولیٔ عہد کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے اور ہر آن اُن کے اشارۂ چشم وابرو کے منتظر رہا کرتے ہیں، وہ لوگ مفتی صاحبؒ کی اِس مدلل ایمانی گفتگو پر لاجواب ہو کر خاموش ہو گئے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے ہمراہ راقم کے ملک وبیرون ملک کے اسفار

مفتی صاحبؒ کے ہمراہ خطابت وتقریر کے تعلق سے اور دارالعلوم الاسلامیہ کے تعارف کے سلسلے

میں بمبئی، گجرات، لکھنؤ اور مئو وغیرہ کے متعدد اور دوبار خلیجی ممالک کے بھی اسفار ہوئے، نیز دار العلوم الاسلامیہ کے کتب خانہ کے لئے کتبِ مراجع کے انتخاب اور خریداری کے سلسلے میں دو مرتبہ سعودی عرب کا بھی سفر ہوا، جس میں ریاض اور جدہ کے اہم مکتبوں سے کتابوں کی خریداری کے علاوہ ان کے ہمراہ الحمدللہ زیارتِ حرمین شریفین اور عمرہ وحج کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ ان اسفار کے دوران ان کے اخلاقِ کریمانہ کے جوہر کھل کر سامنے آئے۔

ریاض اور جدّہ کے قاسمی احباب نے حضرت مفتی صاحبؒ کی آمد پر بڑی خوشی کا اظہار کیا، اور ان کے اعزاز میں ریاض میں ایک بڑا جلسہ بھی ہوا جس میں وہاں کے مقیم ہندوستانی علماء اور دانشور حضرات نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور مفتی صاحبؒ کے قیمتی بیان سے مستفید ہوئے۔ نیز مفتی صاحبؒ نے اہل تعلق کی دعوت پر تقریر وخطابت کے سلسلے میں برطانیہ اور کناڈا کے بھی متعدد اسفار کئے، جس سے وہاں کے مستفیدین کو بہت فائدہ پہونچا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑی جاذبیت اور کشش اور ان کی زبان میں بلا کی حلاوت اور تاثیر رکھی تھی، چنانچہ مئو کے ایک سفر کے دوران وہاں کے ایک صاحب خیر عالم نے یہ کہہ کر سو روپئے زرِ تعاون دینا چاہا کہ میں نے آج تک کسی مدرسہ کو سو روپے سے زیادہ چندہ نہیں دیا ہے، تو مفتی صاحب نے اُن سے مسکراتے ہوئے فرمایا: ہم تو یہ طے کر کے آئے ہیں کہ آپ سے دو سو روپئے لے کر رہیں گے، انہوں نے ہنستے ہوئے فوراً دو سو روپئے دے دیئے۔

اسی طرح واپی گجرات کے ایک سفر میں خطاب کے دوران یہ مشہور حدیث: ”السخی قریب من اللہ، قریب من الجنة، قریب من الناس، بعید من النار، و البخیل بعید من اللہ، بعید من الجنة، بعید من الناس، قریب من النار، و الجاھل السخی احب الی اللہ عز و جل من عالم بخیل“۔ (سنن الترمذی)

جب انہوں نے اپنے منفرد اسلوب میں پڑھ کر اس کی دلنشیں تشریح کی تو فکر آخرت کے تعلق سے سامعین کے دلوں کی عجب کیفیت ہوگئی اور وہ فوراً دستِ تعاون دراز کرتے ہوئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی اپنے وطن کے لوگوں میں ہر دل عزیزی

عام طور پر انسان کی اپنے اہل وطن کی نگاہوں میں کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہیں ہوتی، کسی شاعر نے کہا ہے کہ ع

عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

لیکن حضرت مفتی صاحب کی مدرسہ ضیاء العلوم تمبور کے اہتمام کے دوران مثالی خدمات، اُن کے تعلیمی اور تعمیری کارنامے لوگوں کی نگاہوں میں تھے کہ انہوں نے اپنی کئی سال کی شب و روز کی محنت و کوشش اور جد و جہد سے مدرسہ کی عظمت کو چار چاند لگا دیا تھا، اسی بنا پر وہ حضرت مفتی صاحب کو دل سے چاہتے اور اُن پر اپنی جان چھڑکتے تھے، چنانچہ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ وہ تمبور چھوڑ کر برائے تدریس دار العلوم الاسلامیہ بستی چلے گئے تو اُن کے دلوں میں مفتی صاحب کی محبت و عظمت اور ان کی ہر دل عزیزی دیکھئے کہ وہاں کے سارے مؤقر لوگ دو بسوں میں بھر کر ان کو تمبور واپس لے جانے کے لئے بستی آ گئے، پھر حضرت والد ماجدؒ نے ان لوگوں کی ضیافت کرنے کے بعد ان کو سمجھایا کہ مفتی صاحب کا تعلق آپ لوگوں اور آپ کے مدرسہ ضیاء العلوم سے برقرار رہے گا اور وہ گاہے گاہے اس کی نگرانی کے لئے وہاں جاتے رہیں گے تو وہ لوگ بہ مشکل ان کے یہاں قیام اور تدریس پر راضی ہوئے، اور یہ حقیقت ہے کہ تمبور اور سیتاپور کی شناخت حضرت مفتی صاحبؒ کی ذاتِ گرامی سے تھی۔

حضرت والد ماجدؒ کی مفتی صاحبؒ پر نگاہِ کرم اور توجہِ خاص

حضرت مفتی صاحبؒ کی اسی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی بنا پر حضرت والد ماجدؒ کی نظر میں اُن کی بڑی قدر و منزلت تھی، چنانچہ وہ ہر موقع پر اُن کا خاص خیال رکھتے تھے۔

حضرت والد ماجدؒ کو مفتی صاحبؒ کے صحت کی بڑی فکر رہا کرتی تھی، وہ مستقل پیٹ کے عارضہ کا شکار تھے، ایک بار علاج کیلئے ان کو میرے ہمراہ سنبھل کے مشہور و معروف طبیب حکیم رئیس احمد صاحب مرحوم کے پاس بھیجا جن کی طبابت و حذاقت کا دور دور تک شہرہ تھا، اور یہ واقعہ ہے کہ یونانی طریقہ علاج میں انہیں دستِ شفا حاصل تھا، چنانچہ ان کی دوا سے مفتی صاحبؒ کو کچھ فائدہ بھی ہوا،

اسی موقع کی مناسبت سے حضرت والد ماجدؒ کی ایما پر مدرسہ امدادیہ رامپور روڈ مراد آباد میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں راقم اور حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریریں ہوئیں، اُس میں تمام اساتذہ، طلبہ اور معززینِ شہر شریک ہوئے، اور جلسہ بڑا کامیاب رہا۔

قضیۂ مسجد آغا دریا خاں

دارالعلوم الاسلامیہ سے متصل مسجد محلہ آغا دریا خاں پر ناجائز قبضہ اور تسلّط کے لئے مبتدعین نے سنگھ پریوار کے ساتھ مل کر جو خونی ڈرامہ کھیلا، نمازیوں پر شب خون مارا اور مسجد میں غنڈہ گردی کی اور مقامی انتظامیہ کو غلط فہمی میں ڈال کر دارالعلوم کے ذمہ داروں کو مختلف جھوٹے مقدمات میں پھنسا دیا تو ایسے نازک مرحلے پر جن علماء ومشائخ اور عمائد نے کارکنانِ دارالعلوم کی ڈھارس بندھائی، ان کے لئے اضطراری دعائیں کیں، اور اپنے مقام ومرتبہ اور مزاج ومسلک کے برخلاف حکام اور متعلقہ افسران تک اہل دارالعلوم کی صفائی دی اور ان کے لئے کھل کر سفارش کی اور اسے اپنا ذاتی مسئلہ بنا لیا، اُن میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ جیسی عظیم شخصیات سب سے آگے تھیں، اور اس طرح انہوں نے دین کی خدمت کیلئے بےنفسی و بےغرضی، خود فراموشی اور خاکساری وتواضع اور اس کیلئے ہمہ جہتی جدوجہد کی جو اعلیٰ مثال قائم کی وہ اِن جیسے اللہ والوں ہی کا حصہ رہا ہے۔ ان کے علاوہ اس سلسلہ میں دارالعلوم الاسلامیہ کے اساتذہ میں سب سے نمایاں کردار حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ کا رہا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے دل وجان سے دارالعلوم کے ذمہ داروں کا تعاون کیا، اس موقع پر حضرت والد ماجدؒ اور میرے ہمراہ حکومت کے ذمہ داروں سے ملاقات کیلئے متعدد بار لکھنؤ تشریف لے گئے اور ان سے ملاقات کے دوران حضرت والد ماجدؒ کے موقف کا دفاع پوری قوت کیساتھ ان کے سامنے کیا، اور اس سلسلے میں مختلف مواقع پر عوام وخواص کے سامنے بھی مدلل خطابات اور تقریریں انہوں نے کیں۔

اُنہیں مصیبت وآزمائش کے ایام میں ہفتوں راقم کا قیام بارودخانہ گولہ گنج لکھنؤ میں حضرت مفتی

صاحبؒ کے گھر پر رہا، جب کہ وہ اپنے تدریسی فرائض انجام دینے کے سلسلے میں دار العلوم الاسلامیہ میں قیام پذیر تھے، حضرت مفتی صاحبؒ کی عدم موجودگی میں ان کی اہلیہ مرحومہ (اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے) اور صاحبزادگان خاص طور پر عزیزان شمیم احمد و محمد طارق سلمہما نے بڑے خلوص ومحبت کیساتھ مہمان نوازی کی، اور میری تمام ضروریات کا خیال رکھا، حق تعالیٰ اس پورے گھرانے کو دین ودنیا کی تمام خیرات وحسنات سے نوازے۔ (آمین)

حضرت والد ماجدؒ سے مفتی صاحبؒ کا محبانہ ومخلصانہ تعلق

حضرت والد ماجدؒ سے حضرت مفتی صاحبؒ کو قلبی تعلق اور والہانہ لگاؤ تھا، اس کا اظہار مختلف مواقع پر ہوتا رہتا تھا، چنانچہ ایک باریہاں کے ایک مشہور ومعروف گاؤں کو ہریاواں ضلع سنت کبیر نگر کے ایک اہم اجلاس میں جس میں عوام کے ایک جم غفیر اور مقامی اور علاقائی علماء کرام کے علاوہ دار العلوم الاسلامیہ کی مرکزی شخصیات بھی شریک تھیں، راقم کی پہلی تقریر کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ حضراتِ علماء کرام وبرادرانِ اسلام'' آپ حضرات کو وہ زحمتیں پیش نہیں آئیں جو بہت سے لوگوں کو پیش آتی ہیں، مقررین کے یہاں چکّر لگانا، بار بار سفر کرنا اور ہر وقت سراپا انتظار بنے رہنا، اور گاڑیوں کا انتظام کرنا، اور ٹرین کی راہ دیکھنا کہ کون سا مقرر کس ٹرین سے آرہا ہے، اور کون نہیں آرہا ہے، اور اگر نہیں آرہا ہے تو کیا شکل بنے گی، ان تمام زحمتوں سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچالیا، ایک مرکز یعنی دار العلوم الاسلامیہ سے وابستگی کی وجہ سے، آپ نے ایک مرکز سے اپنے کو وابستہ کیا ہے ؎

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

دار العلوم الاسلامیہ بستی سے آپ کا تعلق ہے، اس تعلق نے آپ کو بہت سی فکروں اور بہت سی زحمتوں سے بچالیا۔

لوگ یہ کہتے ہیں کہ قیادت کا فقدان ہے، یعنی کوئی رہبر نہیں، آپ یقین فرمائیے کہ قیادت کا فقدان نہیں ہے ؎

عاشقِ کجا کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب است

ایسا کوئی عاشق نہیں ہے کہ معشوق یا محبوب اس کو محبت کی نظر سے نہ دیکھے، درد ہی نہیں، ورنہ معالج موجود ہے۔

قیادتیں ہمیشہ اعتماد کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہیں، یہ بات میں نے بار بار بستی کی فضاؤں میں کہی ہیں، اور بستی کی فضائیں اس کی شہادت دیں گی اگر شہادت کی ضرورت پیش آئی کہ اگر ایک رکشہ چلانے والے پر آپ اعتماد کرلیں تو آپ کی عزت کے لئے، آپ کی قوت کیلئے اور آپ کی آن بان کی حفاظت کیلئے اس کے اوپر نیند حرام ہوجائے گی، اور اس کا ضمیر اس کو ملامت کرے گا کہ یہ قوم ہم پر اعتماد کرتی ہے، ہم کو راحت کو تج دینا چاہئے، ہم کو دن اور رات ایک کردینا چاہئے، ہم کو ایڑی چوٹی کا زور لگادینا چاہئے ؎

دل کا سودا مجھے کرنا نہیں تحقیر کے ساتھ
جان حاضر ہے اگر لیجئے توقیر کے ساتھ

مسلمانوں میں اعتماد ہی نہیں رہا، وہ کسی پر اعتماد کرنا جانتے ہی نہیں، یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے اور یہ کتنا رونے کا مقام ہے کہ بکریوں کا ریوڑ بھی ایک گلّہ بان رکھتا ہے، گایوں کا ریوڑ ایک چرواہا رکھتا ہے، اور یہ خیر الامم "کنتم خیر امةٍ" یہ تمام امتوں کی سردار بغیر راعی کے ہے، بغیر امام اور رہبر اور بغیر مرکز کے ہے، حدیث میں فرمایا گیا "ید اللہ علی الجماعة" اللہ کا ہاتھ جماعت کے اوپر ہوتا ہے ؎

کس نیاید بزیر سایۂ بوم
وَر ہُما از جہاں شود معدوم

"ہُما" کے بارے میں ایک تخیل ہے کہ وہ ایسا پرندہ ہے کہ اس کے سایہ کے نیچے جو آجاتا ہے وہ بادشاہ بن جاتا ہے، لیکن اگر "ہُما" دنیا میں نہ رہے تو بھی اُلّو کے سائے میں لوگ نہیں آتے، اور اگر ہُما موجود ہو اور پھر بھی لوگ اُلّو کے سائے میں رہیں تو ان کی دانشمندی اور عقلمندی کے اوپر مرثیہ پڑھنا چاہئے کہ دانش سے وہ محروم ہوچکے ہیں اور ان کی بے حسی پر مہر لگ چکی ہے، آج مسلمانوں کا یہی

حال ہے۔

اللہ کا فضل ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے اللہ والوں سے، علمائے ربانیین سے قیامت تک کوئی سرزمین خالی نہیں ہوسکتی، حدیث نبوی کے مطابق ''قیامت برپا نہیں ہوگی جب تک روئے زمین پر لا الٰہ الا اللہ کہنے والے موجود رہیں گے''۔

علمائے ربانیین موجود ہیں مگر آپ ان پر اعتماد کرنا نہیں جانتے، آپ اُن سے قریب ہونا نہیں جانتے ؎

کسی نے یہ بقراط سے جاکے پوچھا — مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دُکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا — کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں — کہے جو طبیب اُس کو ہذیان سمجھیں
سبب یا علامت گر اُن کو سُجھائیں — تو تشخیص میں سو نکالیں خطائیں
دوا اور پرہیز سے جی چُرائیں — یوں ہی رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں
طبیبوں سے ہرگز نہ مانوس ہوں وہ — یہاں تک کہ جینے سے مایوس ہوں وہ

(بقراط ایک بہت بڑا طبیب تھا)

اِس تمہیدی خطاب کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے حضرت والد ماجدؒ اور دار العلوم الاسلامیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے سامعین سے فرمایا:

بھائیو! اللہ کا فضل ہے کہ حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب کی صورت میں اس نے آپ کو ایک عظیم قائد اور رہبر دیا ہے، جنہوں نے صرف ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں آپ کی ناک اونچی کی ہے اور آپ کا بول بالا کیا ہے، علم وفضل، اخلاص، دیانت، شرافت، ہمدردی اور انسانیت نوازی کونسی چیز ہے جو اُن میں موجود نہیں ہے ؎

مزہ برسات کا چاہو تو اِن آنکھوں میں آ بیٹھو
سیاہی ہے، سفیدی ہے، شفق ہے، ابرِ باراں ہے

یہ اُن کا سوزِ جگر اور اخلاص تھا، اخلاص کی تاثیر یہ ہے کہ ''من اخلص للہ اربعین یوماً،

ظہرت ینابیع الحکمة علی لسانہ“ چالیس دن تک اگر کوئی اخلاص سے کام کرے تو اس کی زبان سے حکمت کے چشمے اُبلتے ہیں۔

انہوں نے اخلاص کیساتھ یہ ادارہ دارالعلوم الاسلامیہ قائم کیا تو بستی جیسے کوردہ شہر میں کہ جس میں بدعات ورسومات اور جہالتیں تھیں، اوہام کا پہرہ تھا، اس مدرسہ کو قائم کرنے کے بعد انہوں نے ”صحیح عقیدے“ کا جھنڈا گاڑ دیا، پورے شہر کی تہذیب کو بدل کر رکھ دیا ہے اس مدرسے نے، پورے شہر کی ثقافت پر اس مدرسے نے اپنا اثر ڈالا ہے، شہر کی جس سڑک پر آپ نظر ڈالئے اُس سڑک پر ٹوپی، کرتے اور پائجامے والے لوگ آپ کو نظر آئیں گے، پہلے دیہات کے مسلمان بستی شہر میں جاتے تھے تو اُوپرا پَن، اجنبیت اور وحشت محسوس کرتے تھے، اور اِس وقت اُن کو قطعاً اجنبیت اور وحشت محسوس نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنائیت محسوس کرتے ہیں، یہ سب اس مدرسے کا ثمرہ اور برکت ہے، جس کو حضرت مولانا نے اپنے خونِ جگر سے سیراب کیا ہے“۔

ایک دوسرے خطاب میں حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ”دارالعلوم الاسلامیہ کا قیام حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب کا سب سے عظیم کارنامہ ہے، یہ حقیقت ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بعد لکھنؤ سے لیکر کلکتہ تک کسی شہر کے وسط میں اتنا بڑا ادارہ نہیں ہے۔

دارالعلوم الاسلامیہ مشرقی یوپی کے مسلمانوں کا دھڑکتا ہوا دل ہے اور بستی کے مسلمانوں کی آبرو اور ان کا تاج محل ہے، اس نے خاص طور پر بستی اور اس کے اطراف کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور انہیں فخر سے سر اُٹھا کر چلنے کا حوصلہ عطا کیا ؎

شورشِ عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

اس کے قیام سے پہلے یہاں کے مسلمان برادرانِ وطن سے بہت مرعوب اور دبے دبائے تھے، دارالعلوم الاسلامیہ نے ان کی مرعوبیت ختم کردی اور ان کو ہمت وجرأت اور وقار کیساتھ جینے کا سلیقہ اور سبق سکھایا اور ان کو اپنے طرزِ عمل سے یہ پیغام دیا ؎

یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں“

(معمارِ قوم وملت حضرت اقدس مولانا محمد باقر حسین قاسمیؒ : زندگی کے درخشاں نقوش ،ص:۱۰۰،۱۰۱)

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو صبر وضبط، تحمل و بردباری، جفاکشی وسخت کوشی جیسی صفات سے بھی نوازا تھا، وسائلِ تنعم اور اسباب راحت کی فراوانی کے باوجود وہ راحت طلب نہیں تھے بلکہ سخت محنت اور جفاکشی کے عادی تھے، اور اپنے زیرِ اہتمام مدارس کے لئے انتھک محنت کرتے تھے، اور دیگر مدارس کو فیض پہونچانے میں ذرہ برابر دریغ نہیں کرتے تھے، بڑی بڑی رقمیں باہر سے لاکر دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس کو دیتے تھے، حسد، رقابت اور تنگ نظری اُن کو چھوکر نہیں گذری تھی، وسیع القلبی ان کا شیوہ تھی، ان کی عقیدت کا دائرہ بہت وسیع تھا، وہ ہر عظیم انسان کی تعظیم وتوقیر کرتے تھے، ان کی عقیدت اکابرِ دیوبند تک محدود نہیں تھی، وہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اور حضرت مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئیؒ کے بھی بیحد عقیدت مند تھے، اور حضرت اقدس مولانا قاری سید صدیق احمد صاحبؒ کے تو وہ چہیتے اور لاڈلے تھے، چیلنج کو قبول کرنا اور بڑی سے بڑی رُکاوٹ کو خاطر میں نہ لانا اُن کی فطرتِ ثانیہ تھی۔

بستی شہر کے بیچوں بیچ شاہراہِ عام پر جب ایک وسیع وعریض زمین خریدی گئی اور اس پر تعمیری سرگرمیاں شروع ہوئیں اور پورے ضلع میں چرچا ہوا کہ دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے کھاتے میں ایک خطیر رقم جمع ہے تو ایوانِ کفر میں زلزلہ آگیا اور فرقہ پرست ذہنیت کے ہندو وکیلوں نے قانونی رُکاوٹیں کھڑی کردیں، اور دارالعلوم الاسلامیہ کے کھاتے کو منجمد کرانے کیلئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگادیا، مگر واہ رے حضرت مولانا! سب کا مردانہ وار مقابلہ کرکے اُن کی چھاتی پر کروڑوں ٹن کی دارالعلوم الاسلامیہ کی عمارت قائم کرکے دَم لیا ؎

طوفان کررہا تھا مِرے عزم کا طواف
دُنیا سمجھ رہی تھی کہ کشتی بھنور میں ہے

عام طور پر لوگ اپنے دشمنوں کی چھاتی پر پتھر یا چٹان رکھ دیتے ہیں، لیکن حضرت مولاناؒ نے

دشمنوں کی چھاتی پر پورا پہاڑ لاد دیا۔

(معمارِ قوم وملت حضرت اقدس مولانا محمد باقر حسین قاسمیؒ: زندگی کے درخشاں نقوش، ص: ۴۲۷، ۴۲۸)

حضرت مفتی صاحبؒ سے راقم کا قلبی تعلق

دار العلوم دیوبند میں جب میں شریکِ دورۂ حدیث تھا اُسی وقت سے مفتی صاحب کی عظمت میرے نہاں خانۂ دل میں تھی، اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ دار العلوم کے میرے امتحان داخلہ اور اس کے بعد کے تکمیلی مراحل میں اُن ہی کا بنیادی کردار تھا جیسا کہ میں ابتدا میں لکھ چکا ہوں۔

حضرت مفتی صاحب باضابطہ میرے استاذ نہ تھے اس لئے کہ اُس وقت دورۂ حدیث کا کوئی سبق اُن سے متعلق نہ تھا لیکن شرکائے دورۂ حدیث میں میرے بہت سے ایسے رفقاء تھے جن کے وہ محبوب استاذ تھے، دار العلوم سے دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد میں مدرسہ امدادیہ مرادآباد چلا آیا اور حضرت والد ماجدؒ کے حکم سے وہاں تدریس کے فرائض انجام دینے لگا، اس کے دو سال کے بعد دار العلوم الاسلامیہ بستی کا قیام عمل میں آیا۔

اِدھر دار العلوم دیوبند میں انقلاب کے بعد حضرت مفتی صاحب چند سال وقف دار العلوم اور پھر دار العلوم حیدرآباد کے قیام کے بعد اپنے وطن تمبور تشریف لائے اور اپنے مادرِ علم مدرسہ ضیاء العلوم کا نظم ونسق سنبھال لیا اور چند ہی سال میں اس نے ان کی جدوجہد سے شہرت ومقبولیت کے نقطۂ عروج کو چھو لیا۔

ایک طویل عرصہ کے بعد میری اُن سے ٹیلیفون سے گفتگو ہوئی تو میں نے ان کو حضرت والد ماجد کی ایماء پر دار العلوم الاسلامیہ بستی میں تدریس کی دعوت دی، جس کا ذکر تفصیل سے گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

شہر لکھنؤ کے مشہور محلہ چکمنڈی جو مولوی گنج سے متصل ہے اس کا ہر گھر مفتی صاحبؒ کا مرید اور مفتی صاحب اس کی مراد تھے، مفتی صاحبؒ کے ہمراہ ان کے محبین اور اہل تعلق سے ملاقات کے دوران متعدد بار میں نے اس کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔ یہ محلہ ایک زمانہ میں امام اہلسنت حضرت

مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کی اصلاحی سرگرمیوں کی بطور خاص جولان گاہ رہا ہے، دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے زمانے میں حضرت مفتی صاحبؒ ماہ رمضان المبارک میں لکھنؤ کے اسی محلہ میں قیام فرما کر اس کی جامع مسجد اور دوسری مسجد کریم شاہ میں مستقل طور پر بڑی پابندی سے درس قرآن کریم دیا کرتے تھے، علاوہ ازیں ہر سال ماہ محرم میں احاطۂ شوکت علی رکاب گنج کے امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی ہال میں ہونے والے پندرہ روزہ شہدائے اسلام کے جلسوں اور مدحِ صحابہؓ کے عنوان سے منعقد ہونے والے دیگر محلوں کے پروگراموں میں خطاب کرنے کے لئے وہ خاص طور سے مدعو کئے جاتے تھے۔ شہر کا کوئی اہم اجلاس ان کی شرکت کے بغیر ادھورا سمجھا جاتا تھا۔

مفتی صاحبؒ کے اہل خانہ بھی مسجد کریم شاہ کے پاس ایک کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ دارالعلوم الاسلامیہ میں تدریس کے زمانہ میں وہ محلہ چکمنڈی سے قریب بارودخانہ گولہ گنج میں ایک مکان خرید کر مع اہل خانہ اس میں منتقل ہو گئے، لکھنؤ میں مکان خریدنے سے پہلے میں نے اُن سے کہا کہ محلہ کھدرا میں آپ مکان خرید لیں وہاں کم قیمت میں اچھا مکان مل جائے گا، تو مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے قلبِ شہر ہی میں مکان لینا ہے، اور کھدرا سے بہتر تو ہمارا تمبور ہی ہے اور واقعی یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ کے اصل محلوں میں حضرت گنج اور امین آباد کے علاوہ مولوی گنج، چکمنڈی اور گولہ گنج وغیرہ ہی کا شمار ہے، اور کھدرا وغیرہ محلے بہت بعد میں آباد ہوئے ہیں اور وہاں اکثر لوگ باہر سے آکر بسے ہیں، جن کا اصل شہر میں شمار نہیں ہے۔ شہر لکھنؤ کی تہذیب اور شام اودھ کے بارے میں ان کی جمالیاتی حِس بہت تیز تھی، اور ان کو اس شہر سے فطری لگاؤ تھا، اور اس کے بارے میں ان کے وہی جذبات واحساسات تھے جس کی ترجمانی لکھنؤ کے مشہور شاعر حضرت امیر مینائی مرحوم نے اپنے اس شعر میں کی ہے ؎

کہاں ہوں گی امیرؔ ایسی ادائیں حور وغلماں میں
رہے گا یاد ہم کو خلد میں بھی لکھنؤ برسوں

تو ذکر حضرت مفتی صاحبؒ سے میرے قلبی لگاؤ اور تعلقِ خاطر کا چل رہا تھا، مفتی صاحبؒ کی ہر گھریلو تقریب اور پروگرام میں میری شرکت لازمی تھی سب سے پہلے ان کی بڑی بیٹی کا عقد مسنون

''محفل میرج ہال'' مولوی گنج لکھنؤ میں ہوا، اس میں بستی سے آکر میں نے شرکت کی، اس کے بعد ان کے بڑے بیٹے عزیزم شمیم احمد سلمہ کا رشتہ طے کرنے کے موقع پر مفتی صاحب کے گھر پر ایک مختصر سا پروگرام ہوا، جس میں ان کے خاص احباب ہی مدعو تھے اس میں میرا نام بھی تھا، چنانچہ میں اس میں بھی شریک ہوا۔ رشتہ طے ہوجانے کے بعد ان کا نکاح پڑھانے کے لئے مفتی صاحب نے خاص طور پر مجھے مدعو فرمایا تھا لیکن اچانک میرے ایک اہم سفر کی وجہ سے اس تقریب سعید میں شرکت نہ ہوسکی حالانکہ حضرت مفتی صاحب کا بڑا اصرار تھا کہ شمیم کا نکاح آپ ہی کو پڑھانا ہے۔

دارالعلوم الاسلامیہ میں سب سے زیادہ مزاجی مناسبت اور ان کا قلبی لگاؤ مجھ ہی سے تھا، ہر بات اور ہر کام میں حتی کہ اگر ان کے رہائشی مکان کی بجلی بھی غائب ہوجاتی تو وہاں سے آکر مجھے آواز دیتے کہ فوراً ٹھیک کرادیجئے، چونکہ وہ مطالعہ کے رسیا تھے، درس وتدریس کے بعد ان کا سب سے محبوب مشغلہ مطالعۂ کتب تھا جس میں وہ کوئی خلل اندازی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔

ان کے ہمراہ میں نے بہت سے ملکی اور غیر ملکی اسفار کئے لیکن ان کے ساتھ سفر کبھی محسوس نہیں ہوتا تھا وہ ہر وقت باغ و بہار اور خوش وخرم رہتے اور اپنے لطائف وظرائف سے محفل اور مجلس کو بھی زعفران زار بنائے رکھتے تھے۔

بستی قیام کے دوران روزانہ عصر کے بعد کی مجالس اس پر مستزاد تھیں، جس میں علمی لطائف ونکات، برمحل اشعار اور حالاتِ حاضرہ پر بے لاگ تبصرے اور تجزیئے خوب ہوا کرتے تھے، راقم کے ساتھ چائے نوشی کی وہ محفلیں اب خواب وخیال ہوچکی ہیں، آہ! ع

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

بہت دنوں سے ان کی پُشت پر ایک رسولی (گانٹھ) تھی، جو اُبھری ہوئی تھی، جامعہ طبیہ دیوبند کے ممتاز ومایۂ ناز سابق استاذ حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمیؒ جن کا حضرت والد ماجدؒ سے بہت قریبی اور گہرا تعلق تھا، اور وہ گاہے گاہے مدرسہ امدادیہ مرادآباد اور دارالعلوم الاسلامیہ بستی تشریف لاتے رہتے تھے، حضرت مفتی صاحبؒ کے یہاں قیام کے دوران وہ تشریف لائے اور مفتی صاحبؒ سے فرمایا کہ اس رسولی کا آپریشن نہ کرائیے گا، لیکن مفتی صاحب ایک روز میرے ہمراہ شہر کے مشہور

ومعروف سرجن ڈاکٹر مشتاق احمد صاحب کے یہاں تشریف لے گئے اور انہوں نے چند منٹ میں آپریشن کر کے وہ گانٹھ ختم کردی، کہ مفتی صاحبؒ کو کسی درد اور تکلیف کا احساس تک نہ ہوا۔

اسی طرح ایک موقع پر میرا چھوٹا بیٹا عزیزم محمد اشرف سلمہٗ رات کو سوتے میں اچانک بیہوش ہو گیا میں فوراً اس کو لے کر ہاسپٹل بھاگا تو میرے پیچھے حضرت مفتی صاحبؒ دارالعلوم کے بعض اساتذہ کے ہمراہ میری تسکین وتسلی کیلئے وہاں تشریف لے آئے، اسی اثنا میں وہ ہوش میں آچکا تھا، یہ ہے غایتِ تعلق جو مفتی صاحبؒ کو مجھ سے تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی تدریسی زندگی کا سب سے طویل عرصہ دارالعلوم الاسلامیہ میں بڑے سکون واطمینان سے گذرا، اس کی بنیادی وجہ ایک تو حضرت والد ماجدؒ کی خوئے دلنوازی اور ان کی کرشماتی شخصیت تھی، اور دوسری اہم وجہ حضرت مفتی صاحبؒ کی میرے ساتھ طبعی ومزاجی ہم آہنگی تھی کہ یہاں ان کے گیارہ سالہ طویل دورِ قیام میں سفر یا حضر کے دوران کسی موقع پر کبھی ہم دونوں کے درمیان کوئی تکدر، ناراضگی اور ناگواری تک پیش نہیں آئی۔

ہر مرحلے پر میں نے ان کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھا اور ان کے مزاج کی رعایت کی، اور وہ میرے ساتھ شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے رہے۔

دارالعلوم الاسلامیہ میں دو استاذوں کا تقرر

دارالعلوم الاسلامیہ میں مفتی صاحبؒ کے دورانِ تدریس درسِ نظامی کی بنیادی کتابوں کے ایک اچھے استاذ جو حضرت مفتی صاحبؒ کے درسی ساتھی بھی رہ چکے ہیں، محترم مولانا مقبول احمد بیگ قاسمی بہرائچی زیدمجدہم ان کا تقرر مفتی صاحبؒ کی ایما پر ہوا، وہ اپنی ہر درسی مشکل میں مفتی صاحبؒ سے رُجوع ہوتے تھے، اور ماشاء اللہ اب تک یہاں وہ درس وتدریس کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

دوسرے استاذ مولانا قاری احمد سعد قاسمی صاحب جو دارالعلوم دیوبند کے اپنے زمانہ کے مشہور مبلغ حضرت مولانا ارشاد احمد فیض آبادیؒ کے فرزند ارجمند ہیں، بحیثیت استاذ ان کی آمد بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے مشورے سے ہوئی، یہ بطور خاص مفتی صاحبؒ سے علمی استفادہ کرتے تھے۔

عصر کے بعد ان کے کمرے پر چائے کا دور چلتا تھا، جس میں مفتی صاحبؒ کے علاوہ میں بھی شریک ہوتا تھا، قاری احمد سعد صاحب کا چائے کا ذوق اپنے والد مرحوم کی طرح بہت نفیس تھا، اور قرآن کریم بھی وہ بہت عمدہ پڑھتے تھے، ان کے پیچھے نماز پڑھنے میں بڑا لُطف ملتا تھا۔

قاری احمد سعد صاحب نمازِ فجر میں بطور خاص طوالِ مفصل، نماز عشاء میں اوساطِ مفصل اور نماز مغرب میں قصارِ مفصل کی سورتیں اور بسا اوقات اس کی رکعتِ اولیٰ میں سورۃ البینہ (لم یکن الذین کفروا) پوری پڑھا کرتے تھے، تو ایک سماں بندھ جاتا تھا، اور مقتدیوں میں کیف وسرور کی ایک کیفیت پیدا ہوجاتی تھی۔

ان کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن جامی صاحب استاذ دارالعلوم کی قراءت کے بھی مفتی صاحبؒ بڑے قائل اور مداح تھے، فرماتے تھے کہ ان کی تلاوت میں بڑا سوز اور درد ہے، ان کے پیچھے بھی نماز پڑھنے میں بہت کیف محسوس ہوتا ہے۔

اور مجھے یہاں پر یہ لکھنے میں کوئی تأمل نہیں ہے کہ مفتی صاحبؒ کے یہاں گیارہ سالہ دورانِ قیام میں اُن سے میں نے بھی بہت کچھ سیکھا ہے، اور مجھے بڑا علمی فائدہ ہوا ہے، اب ان کے بعد اُن جیسا با کمال کوئی نظر نہیں آتا، یہ بات بھی اس موقع کی مناسبت سے قابل ذکر ہے کہ وزارتِ اوقاف کویت سے شائع شدہ عظیم موسوعہ فقہیہ کے بعض اجزاء کا اردو ترجمہ فقیہ ملت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے بھی کرایا تھا، یہ حضرت قاضی صاحبؒ کی اُن کے علم وفضل پر اعتماد کی کھلی دلیل ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا ذوقِ شعر گوئی

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے پیرومرشد حضرت مولانا شاہ اسعد اللہ صاحبؒ سابق ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور وخلیفۂ اجل حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرح (جنہیں اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا، نیز ان کو شعروادب کا ایسا معیاری، بلند اور پاکیزہ ذوق عطا ہوا تھا کہ مدارس کے ماحول میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، گفتگو کے دوران زبان کی صحت

اور فصاحت کا وہ بہت اہتمام فرماتے تھے) ایک باکمال فطری شاعر تھے، اور عربی کے مشہور مقولے "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کے مکمل مصداق۔

حضرت ناظم صاحبؒ کا اسمِ گرامی آتے ہی ان کے کہے ہوئے بہت سے قلم برداشتہ اور فی البدیہہ اشعار ذہن ودماغ میں گردش کرنے لگتے ہیں، جن سے ان کی قادر الکلامی اور دیگر علوم وفنون کے ساتھ فن شعروادب میں بھی ان کی مہارتِ تامہ کا اندازہ ہوتا ہے، موقع کی مناسبت سے لذتِ کام ودہن کے لئے چند متفرق اشعار ان کے بھی ملاحظہ ہوں ؎

تُو مہربان ہے تو جہاں مہربان ہے
تُو مہرباں نہیں تو جہاں مہرباں نہیں

رَشک کرتا ہے فلک ایسی زمیں پر اسعدؔ
جس پہ دو چار گھڑی ذکرِ خدا ہوتا ہے

اسعدؔ لکھ ایک نعت رسولِ کریم کی
امراضِ روح و دل کا مداوا کہیں جسے

تمہارے واسطے اسعدؔ کہیں بہتر ہے شاہی سے
کہ اک ادنیٰ غلامِ بارگاہِ مصطفےٰ تم ہو

یہ نگاہِ حضرتِ تھانوی کا اثر ہے اسعدِؔ بے نوا
نظر آ رہی ہیں حقیقتیں تجھے اِس جہانِ مجاز میں

اسعدؔ کی کس بلا کی ہیں جادو بیانیاں
جس نے غزل سنی وہی دیوانہ ہوگیا

اپنے شیخ حضرت تھانویؒ کو خطاب کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں ؎

ہاں ہاں تمہارے حُسن کی کوئی خطا نہیں
میں حُسنِ اتفاق سے دیوانہ ہوگیا

حضرت مفتی صاحبؒ پر یہ مضمون لکھنے کے دوران اپنی ایک ڈائری میں اُنھیں کے لکھوائے ہوئے اُن چند مزاحیہ اشعار پر میری نظر پڑی جو انہوں نے دارالعلوم دیوبند کے تدریس کے عرصہ میں اپنے ایک بے تکلف بزرگ اور فاضل دوست کے بارے میں کہے تھے، جس سے اس فن میں بھی ان کی پختگی اور مہارت آشکارا ہوتی ہے ؎

ہر ایک پیکرِ حسن کے آستاں پر سرِ عاشقی اُن کا خم دیکھتے ہیں
وہ بھرواتے ہیں اور ساقی سے کہہ کر جو اُلفت کی بوتل میں کم دیکھتے ہیں
اُنہیں لوگ زاہد سمجھتے ہیں سمجھیں وہ کچھ اور شئ ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

نغماتِ مسرت

حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے وطن تمبور ضلع سیتا پور کے رہنے والے مولانا مفتی محمد خبیر ندوی صاحب کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر بَرجستہ فی البدیہہ یہ مزاحیہ تہنیتی اشعار کہے، جو قارئینِ کرام کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کئے جارہے ہیں۔

اے حسین تر نغمات، اے جمیل تر جذبات بزم میں چلے آؤ لے کے عنبریں سوغات
آ گیا پیام اُن کا، ہوگئے وہ آمادہ دیکھ حسن نے کھائی عشق سے بالآخر مات
میرے دل سے نکلا تھا اُن کے دل پہ جابیٹھا تیر میں نے پھینکا تھا عشق کی لگا کر گھات
ہوگیا ہے بارآور شجرۂ زن و شوئی کیا یہ کم کرامت ہے سب ہوا ہے راتوں رات
ہم کسی بھی صورت میں عمر بھر نہ بھولیں گے ملنے والے ہیں ہم کو جو حسین تر لمحات
عشق میں تھی بے تابی حُسن میں تھی خودداری دیر ہوگئی یوں ہی ورنہ ٹھیک تھے حالات
اے خبیرؔ بن شبیر اضطراب کم تر گیر کر نہ اس قدر جلدی تُو تلافئ مافات
مفتی بن گئے نوشاہ چھپ گئے مہر و ماہ بادلوں کی جھڑیاں بھی ہوں گی شاملِ بارات

اے شکیلؔ نغمہ زَن دیکھ اُن کا کروفن
یا خدا تبسم میں یہ تلاطمِ جذبات

حضرت مفتی صاحبؒ ایک باکمال نعت گو شاعر کی حیثیت سے

حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت مختلف اوصاف ومحاسن کا عطر مجموعہ تھی، آپ ایک باکمال، ماہر فن استاذ، بلند پایہ مصنف، مایۂ ناز مفسر، شعلہ بیان مقرر، ممتاز خطیب اور دلوں پر رقت طاری کردینے والے بے نظیر و بے مثال واعظ کے علاوہ ایک بہترین اور عمدہ نعت گو شاعر بھی تھے، نمونہ کے طور پر حبِّ نبوی میں ڈوبی ہوئی آپ کی تحریر کردہ یہ دو نعتیں ملاحظہ ہوں۔

تأثراتِ زائرِ حرمین شریفین

نظر کی خیرگی منظر کی تابانی نہیں جاتی
دیارِ طیبہ تیری جلوہ سامانی نہیں جاتی

سمیٹے لاکھ کوئی حسنِ کعبہ اپنی نظروں میں
مگر نظریں ہیں جن کی تنگ دامانی نہیں جاتی

ہوائیں گرم موسم سخت ہے پھر بھی یہ عالم ہے
کہ ذوق وکیف ومستی کی فراوانی نہیں جاتی

کبھی ہنگامِ گریہ حاجیو! ایسا بھی ہوتا ہے
کہ آنسو خشک ہوجاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

ہجومِ عاشقاں کو دیکھ کر یہ گنگناتا ہوں
حقیقت خود کو منوالیتی ہے مانی نہیں جاتی

یہ انسانی سمندر اور طوافِ خانۂ کعبہ
خرد حیراں ہے بے چاری کی حیرانی نہیں جاتی

بچھایا کیوں نہیں ہر ذرۂ بطحا پہ دل ہم نے
وہاں سے آگئے لیکن پشیمانی نہیں جاتی

گوارا کرلیا کیونکر فراقِ گنبدِ خضرا
یہ دنیا ہے کہ جس کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

شکیلِ بے نوا کو بھی زیارت کا دیا موقع
مرے فیاض! تیری فیض ارزانی نہیں جاتی

نعت شریف

فروغِ صداقت رہا کام تیرا
سکونِ دلِ مضطرب نام تیرا

نہ کارِ سکندر نہ ہے نامِ دارا
فقط کام تیرا فقط نام تیرا

بُھلایا زمانے نے ہر نام لیکن
اسے یاد ہے آج تک نام تیرا

اِن آلامِ دنیا کا کیا ہے مداوا؟
بصیرت سے پوچھیں تو لے نام تیرا

شجاعت، عدالت، سخاوت، مروّت
یہ عنواں ہیں جن کے وہ ہے نام تیرا

خدا اور فرشتوں کی تسلیمِ پیہم
پہونچتی ہے جس کو وہ ہے نام تیرا

شکیلِؔ حزیں کو ملی جس سے تسکیں
وہ اُسوہ ہے تیرا وہ ہے نام تیرا

حضرت مفتی صاحبؒ کی اولاد

حضرت مفتی صاحبؒ کی اہلیہ کا کئی سال پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے، اُن کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، جن میں تین بیٹوں اور دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے، اور وہ سب اپنے اہل خانہ کے ہمراہ سکون واطمینان اور خوش حالی کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں، چھوٹے بیٹے کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے، مستقبل قریب میں وہ بھی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ ان شاء اللہ

حضرت مفتی صاحبؒ کا سانحۂ وفات

دار العلوم الاسلامیہ بستی سے تدریسی سلسلے کے انقطاع کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ کا قیام مستقل طور پر لکھنؤ میں رہا، اسی اثناء میں چند سال قبل حضرت مفتی صاحبؒ کی شریک حیات کا بھی انتقال ہوگیا، عمر کے اس پڑاؤ پر ان کا ساتھ چھوٹنے پر وہ ٹوٹ سے گئے تھے، اور مختلف امراض وعوارض نے ان کو گھیر لیا۔ جس کے بعد وقفے وقفے سے میری ملاقات اور گفتگو ان سے ہوتی رہی، یہاں تک کہ سخت بیماری کے دنوں میں عیادت کے لئے بطور خاص ان کے درِ دولت پر حاضر ہوا، جس میں دیر تک مجلس جاری رہی اور مفتی صاحب کی مضمحل صحت نے آنکھوں کو نمناک کر دیا۔

ان کے بڑے صاحبزادے عزیزم شمیم احمد سلمہ جو کلکتہ کے ریلوے ڈپارٹمنٹ میں انجینئر کے اہم عہدے پر فائز ہیں اور سالہا سال سے اپنے اہل خانہ کے ہمراہ وہیں قیام پذیر ہیں وہ حضرت مفتی صاحبؒ کو برائے علاج وہاں لے گئے اور ڈیڑھ سال تک اپنے پاس رکھا، لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا، اور مسلسل ان کی صحت میں گراوٹ ہی آتی رہی تو وہ ان کو ایئر ایمبولینس (AIR AMBULANCE) سے لے کر لکھنؤ آگئے۔

بالآخر اس کے کچھ دنوں کے بعد مفتی صاحبؒ کی وفات کا روح فرسا سانحہ پیش آیا جس نے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور لغزشوں سے درگذر فرما کر ان کی حسنات کا خوب تر اجر عطا فرمائے اور ان کے تلامذہ اور علمی ودعوتی خدمات کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین

○❖○

"کئی دماغوں کا ایک انساں"

خطیب العصر حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ

از: مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی
شیخ الحدیث جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد

محفل سے اٹھ کے رونقِ محفل کہاں گئی
کھل اے زبانِ شمع! کہ کچھ ماجرا کھلے

۱۷؍محرم الحرام ۱۴۴۶ھ مطابق ۲۴؍جولائی ۲۰۲۴ء شب چہارشنبہ طویل، نازک اور پیچیدہ علالت کے بعد بالآخر وہ گھڑی آہی گئی کہ کانوں کو استاذنا المعظم خطیب العصر حضرت مولانا مفتی شکیل احمد صاحب سیتاپوریؒ کی رحلت وفرقت کی صاعقہ اثر خبر سننی پڑی، وہ کیا رخصت ہوئے گویا ایک تابناک عہد رخصت ہو گیا، وہ عہد جوان کے علم وفن، فضل وکمال، انداز وادا، فکر وخیال...... ایک ایک چیز کا نہ صرف یہ کہ گواہ رہا بلکہ لطف اندوز اور فیض یاب ہوتا رہا، وہ علم وادب کی محفلوں کی جان و بہار تھے، ان کا جانا محفلوں کی ویرانی کا سامان بن گیا ؎

رفتی و از رفتنت یک عالمے تاریک شد
تو مگر شمعے چوں رفتی بزم برہم ساختی

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ رب العزت نے ان کی شخصیت کو متنوع اور گونا گوں کمالات ومحاسن کا ایسا جامع بنایا تھا کہ اس دور قحط الرجال میں اس کی نظیر دور دور تک نظر نہیں آتی۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی کتابِ حیات کا یوں تو ہر ہر ورق تابناک ہے، اور ان کے امتیازات وخدمات کا دائرہ بڑی وسعتیں لئے ہوئے ہے، مگر ان کے بنیادی کمالات ومحاسن کا جوہر و عطر جن امتیازات میں بہت نمایاں اور نکھرا ہوا محسوس ہوتا ہے آج کی مجلس میں انہیں کا ذکرِ جمیل مقصود ہے۔

علمی رسوخ اور قابل رشک علمی وادبی ذوق

اللہ نے انہیں بے مثال علمی گیرائی وگہرائی کی دولت سے خوب خوب نوازا تھا، اسلامیات و کلامیات کے پورے سرمائے پر اور ان سے متعلق جملہ علوم وفنون پر اور ان کے مصادر ومراجع اور نصوص وماٰخذ پر جیسی گہری نظر اور بصیرت ودرک ان کو حاصل تھا، وہ انہیں ان کے اقران ومعاصرین میں امتیازی مقام عطا کرتا تھا، اللہ نے انہیں بلند پایہ متبحر ماہر فن اساتذہ سے تلمذ کی سعادت عطا فرمائی تھی، اور اپنے عظیم المرتبت اساتذہ سے انہوں نے علمی مذاق ومزاج اس طرح اور اس درجہ کشید کرلیا تھا کہ مطالعہ، تفکر وتدبر، نکتہ آفرینی، قرآن وسنت اور اکابر کی تصریحات واشارات سے حسب حال و ضرورت برموقع علمی استنتاج ان کی نمایاں شناخت اور محبوب مشغلہ بن گیا تھا، ان کے دروس، خطابات اور طویل یا مختصر مجالس میں شرکت کرنے والے افراد ان کے اس نمایاں امتیاز کو نہ صرف یہ کہ فوراً محسوس کرلیتے تھے بلکہ ان کی علمی عظمت کے قائل اور ان کے گرویدہ ہوکر اٹھتے تھے۔

ان کے روز وشب کے اوقات کا بہت بڑا حصہ علمی مطالعات میں صرف ہوتا تھا، اور اس محبوب مشغولیت پر وہ کبھی کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے، ان کو مشغولِ مطالعہ دیکھ کر بلا مبالغہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ علم کا عاشقِ صادق ہر طرف سے کٹ کر اور کتابوں میں ڈوب کر لعل وگوہر چننے میں مصروف ہے، اور اس مصروفیت سے زیادہ محبوب اسے کچھ اور نہیں ہے، ان کے سرہانے اور مطالعے کی میز پر متقدمین اہل علم کی مرجع ومصدر کا مقام رکھنے والی عربی کتب کا ایسا نایاب ونفیس انتخاب ملتا تھا جو ان کے ذوقِ عالی کا آئینہ دار، ان کی علمی ریاضتوں کا شاہد اور ''چھلکوں کے بہ جائے مغز، زوائد کے بہ جائے اصول اور ثانوی ماٰخذ کی جگہ اولین ماٰخذ ہی کو پیش نظر رکھنے اور اولیت واہمیت دینے''

کے ان کے مزاج واصول کا مظہر ہوتا تھا۔

ان کی مجالس اپنی رنگارنگی، سیاسیات، سماجیات اور فکاہیات سب کا آمیزہ اور انتہائی پرلطف اور ظرافتوں سے لبریز ہونے کے باوجود ''علم وکتاب'' کے ان کے اصل مزاج ومذاق سے کبھی جدا نہیں کی جاسکتی تھیں، موضوع کوئی ہو، مقام کوئی ہو، اور مخاطب اور شرکاء کوئی ہوں، حضرت مفتی صاحب کا علمی رنگ وآہنگ ان کے امتیاز وانفرادیت کا لوہا منوا کر رہتا تھا، ان کی مجالس کا یہ طرز وانداز گویا شرکاء کو بزبان حال عربی شاعر کے بہ قول یہ پیغام دیتا تھا ؎

وَتَحَدَّثْ مَعِيْ عَنِ الْكُتُبِ إِنِّيْ
أَعْشِقُ الْحَرْفَ سِحْرَهُ وَغَرَامَهُ
آهٍ مَا أَحْسَنَ الْكِتَابَ جَلِيْساً
تَلْقَ نَفْعاً وَ سَلْوَةً وَ سَلَامَهُ

اکابر اہل علم میں حضرت امام غزالی، امام رازی، امام طبری، امام زمخشری اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمہم اللہ کے علوم وافکار اور تالیفات سے انہیں قلبی تعلق تھا، اور ان کے حوالے مجالس، دروس و خطابات میں بار بار آتے تھے، بسا اوقات طویل عربی عبارات زبانی نقل کرتے تھے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے بھی حضرت مفتی صاحب کو غایت درجہ عقیدت ومحبت کا تعلق تھا اور ان حضرات کی خدمات، افادات اور امتیازات کا تذکرہ بار بار ان کی زبان پر آتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب کو منجانب اللہ وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ہی مثالی قوتِ حافظہ کی دولت بھی ودیعت ہوئی تھی، عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں پر انہیں ایسا عبور تھا کہ ایسی جامعیت کی مثالیں اس درجے میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں، ہزاروں اشعار نوکِ زبان رہتے تھے، بالعموم عربی اشعار کے ہم معنی اردو وفارسی اشعار برجستگی کے ساتھ پیش کرنے میں کم ہی اہل علم ان کی ہم سری کرسکیں گے، اس کا اعتراف ان کے تمام تلامذہ واضح لفظوں میں کرتے ہیں۔

خالص علمی ذوق کے ساتھ اعلیٰ، نفیس اور ستھرا ادبی ذوق عام طور پر جمع نہیں ہوپاتا، مگر اسے

حضرت مفتی صاحب کی انفرادیت ہی کہا جائے گا کہ جیسا بلند علمی ذوق انہیں میسر تھا ویسا ہی اعلیٰ ادبی مذاق بھی ان کو حاصل تھا، اور اس اجتماع و امتزاج نے ان کی شخصیت کو منفرد جمال اور قابل رشک عظمت عطا کردی تھی۔

تفسیر البیضاوی کے حل و توضیح کے حوالے سے ''التقریر الحاوی'' کے نام سے جو مبسوط اور وقیع علمی خدمت حضرت مفتی صاحب کے قلمِ گہربار سے منظر عام پر آئی تھی اور جس نے کئی دہائیوں سے دنیائے علم کو تفسیری اسرار و رموز اور قرآنی بلاغت و اعجاز کے نمونوں اور گوشوں سے واقف کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور جو ''بیضاوی'' کے حل کے لئے واحد سب سے معتبر، جامع، مقبول، سہل، سلیس، مؤثر اور کامیاب اردو کاوش و خدمت ثابت ہوئی، یہ علمی خدمت حضرت مفتی صاحب کے علمی ذوق کا بیّن ثبوت بھی ہے، علوم و فنون پر ان کی قابو یابی کی دلیل بھی ہے، اور علمی نکتہ آفرینیوں کے ساتھ ادبی لطافتوں کے اجتماع کا حسین شاہ کار بھی ہے، حضرت مفتی صاحب کا یہی علمی اور معقولی رنگ و آہنگ ''سلم العلوم'' کی شرح ''میزان العلوم'' میں بھی نمایاں ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے طلبہ و اہل ذوق کے لئے پچیس اہم موضوعات پر تقاریر کا ایک مجموعہ ''دیکھنا تقریر کی لذت'' کے نام سے دو جلدوں میں ترتیب دیا، ساڑھے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ گراں قدر ذخیرہ تقریروں کے روایتی مجموعوں سے اپنے موضوعات میں اور ان سے بھی زیادہ اپنے مندرجات اور اسلوب و طرز کے حوالے سے بالکل ممتاز و منفرد و جداگانہ مقام رکھتا ہے، دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے احاطے میں حضرت مفتی صاحب نے اس مجموعے کو آخری شکل دی اور خود ان کے اپنے الفاظ میں ''مجھے بے حد مسرت ہے کہ مشرقی یوپی کے شہرۂ آفاق مدرسہ دار العلوم الاسلامیہ بستی کی علم نواز اور پرسکون فضاؤں میں بیٹھ کر ان تقریروں پر نظر ثانی کر رہا ہوں'' رجب ۱۴۱۶ھ مطابق نومبر ۱۹۹۵ء میں یہ مجموعہ پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوا اور اس وقت سے اب تک اپنے متعدد ایڈیشنوں کے ذریعہ اہل ذوق کے لئے علمی و ادبی سوغات ثابت ہو رہا ہے، یہ کتاب اگرچہ تقاریر کا مجموعہ ہے مگر اس کی ایک ایک سطر سے حضرت مفتی صاحب کے علمی اور ادبی ذوق کا امتزاج ہویدا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے تصنیف وتالیف کو اپنا میدان نہیں بنایا، افراد سازی پر اصل توجہ رکھی، ورنہ اللہ نے قلم وتحریر کا وہ ملکہ عطا فرمایا تھا کہ وہ توجہ فرماتے تو ان کے قلمِ گہربار سے متعدد اور متنوع علمی وادبی تخلیقات وتالیفات منظر عام پر آتیں، دار العلوم الاسلامیہ بستی کے ترجمان مجلہ ''فکر اسلامی'' میں ''معارف الکتاب'' کے نام سے درس قرآن کا کالم ان کے قلم سے ہوتا تھا، اور سورۃ الفاتحہ نیز سورۃ البقرہ کے ابتدائی چند رکوع تک وہ مسلسل لکھتے رہے، پھر یہ سلسلہ موقوف ہو گیا، انہوں نے جتنا لکھا ہے اس میں ان کا علمی رسوخ، قرآنی بصیرت، ادبی ذوق اور بلند پایہ مفسرین کی تفاسیر پر گہری نظر سب کچھ نمایاں ہے۔

اس کے علاوہ ان کی متعدد تحریرات ومقالات مختلف رسائل وجرائد بہ طور خاص مجلہ ''فکر اسلامی'' میں موقع بہ موقع طبع ہوتے رہے، میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ پر ان کا بیش قیمت تاثراتی مضمون ''مدارس ومساجد اور معمار مکاتب حضرت مولانا محمد باقر حسین قاسمیؒ'' کے عنوان سے خاص اشاعت میں شامل ہے، اس مضمون میں انہوں نے حضرت والد صاحبؒ کی ایک خاص امتیازی خوبی کا ذکر اپنے ادیبانہ پیرائے میں یوں کیا ہے:

''ایک خداداد خوبی ان کی خاموش طبعی تھی، اُن کا عملِ پیہم اور ان کا طاقتور جذبہ ہی اُن کی زبان تھا، کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کے کارناموں کی روداد پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبانِ ناطق سے زیادہ ان کی زبان ساکت نے کام کیا ہے ؎

ماورائے سخن بھی ہے کچھ بات
مختصر یہ کہ گفتگو نہ کرے

اللہ تعالیٰ جس کو ضرر سے بچانا اور کامران وکامیاب کرنا چاہتا ہے اُس کو خاموش طبع بنا دیتا ہے، ''وهل يكب الناس على وجوههم إلا حصائد ألسنتهم'' انسان کی زبان ہی انسان کو اوندھے منھ گرائے گی، ''هذا الذي أوردني الموارد'' یہ زبان ہی ہے جس نے ہمیں خطروں میں ڈالا ہے، اللہ تعالیٰ نے مولاناؒ کو سکوت پر ایسی قدرت بخشی تھی کہ گرما گرم مجالس اور معرکۃ الآراء اور دلچسپ بحثوں کے موقعوں پر بھی صرف ہوں، ہاں سے کام لیتے تھے، اُن کے کٹر مخالف پر بھی اگر اہل مجلس

تبصرہ کرتے تو بھی وہ اُس میں حصہ لینے سے اجتناب کرتے ؂

ہفتاد و دو طریق حسد کے عدو سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

ان کو اُس کی فرصت ہی نہیں تھی، اُن کو بس اپنے کام سے کام تھا، وہ منفی ذہنیت کے آدمی ہی نہیں تھے، اُن کا خمیر مثبت ذہنیت سے تیار ہوا تھا۔‘‘

(معمار قوم وملت حضرت اقدس مولانا محمد باقر حسین قاسمیؒ: زندگی کے درخشاں نقوش: ۴۲۵-۴۲۶)

عارف باللہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ سے حضرت مفتی صاحب کو غایت درجہ عقیدت ومحبت تھی، حضرت مفتی صاحب نے اپنے ایک تاثراتی مضمون میں کیا خوب تحریر فرمایا ہے: ؂

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

تواضع، مسکنت، بے نفسی، صبر، بردباری، ہمدردی اور غم خواری چمن انسانی کے وہ پودے ہیں جن کی آبیاری خون جگر سے ہوتی ہے، ایک متواضع، بے نفس اور بردبار وغم خوار انسان کو نہ جانے کتنی جگہ کڑوے گھونٹ پینے پڑتے ہیں، اور نہ جانے کتنی بار پتّے کو پانی کرنا پڑتا ہے، قدم قدم پر نفس کو لگام لگانا، اور ہر مرحلہ پر خواہشات کے طوفان کو دبانا انتہائی بے جگری کی بات ہے ؂

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفس امّارہ کو گر مارا

ان اوصاف کے ساتھ ساتھ اگر کوئی شخص عبادت وریاضت تعلیم وتعلّم تذکیر وتزکیہ اور خدمتِ خلق میں پوری طرح سرگرم عمل ہو تو اس کو مجموعۂ اضداد ہی کہا جائے گا، یہ حیرت انگیز جامعیت توفیق الٰہی کے بغیر نصیب نہیں ہوسکتی، بعض نفوس قدسیہ کو فیاض ازل کی طرف سے ایسی طبیعت عطا کی جاتی ہے کہ انہیں کسی صورت قرار نہیں آتا، ہر کام کو کر ڈالنے کی خواہش اور ہر نیکی میں حصہ لینے کی آرزو ان کے دل میں موجیں مارتی رہتی ہے، بہت کچھ کر ڈالنے کے باوجود ان کا احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ نہیں

کیا، وہ ''مَا عَرَفْنَاکَ حَقِّ مَعْرِفَتِکَ وَمَا عَبَدْنَاکَ حَقِّ عِبَادَتِکَ'' کا مظہر ہوتے ہیں، ان کی بے قراراور بے چین طبیعت کو دیکھ کر ان سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

شرر و برق نہیں شعلۂ و سیماب نہیں
کس لئے پھر تو ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

علامہ اقبال اپنے دور کے قلندر تھے، اور قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید، انھوں نے دیکھ کر یہ کہا ہوگا کہ جن کے سینے محبت الٰہی سے سرشار ہوتے ہیں، ان میں بجلی کی سی تڑپ اور حور کی سی پاکیزگی ہوتی ہے، وہ مسیحا نفسی کے حامل ہوتے ہیں، ان کے اندر رب العزت کی شان بے نیازی کی جھلک ہوتی ہے، وہ فرشتوں کی سی عاجزی کی صفت سے آراستہ ہوتے ہیں، جہاں یہ اوصاف یکجا دکھائی دیں، وہاں یقین کر لیجئے کہ محبت کی چنگاری سلگ رہی ہے ؎

تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے ابن مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزاء کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جن کی شان یہ ہوتی ہے ''لا یَحْسُدُ الاَخْیَارَ وَلا یَعِیبُ الاشْرَارَ'' وہ اخیار سے حسد نہیں کرتے، اور اشرار کی عیب جوئی نہیں کرتے وہ ''اَبْصَرُ النَّاسِ مَن کَانَ بِعُیُوبِہٖ بَصِیْرًا وَعَنْ عُیُوبِ غَیْرِہٖ ضَرِیْرًا'' ''بینا وہ ہے جس کی آنکھیں اپنے عیوب پر کھلی ہوئی ہوں، اور دوسرے کے عیوب کی طرف سے بند ہوں'' کا مصداق ہوتے ہیں، گویا وہ اپنی زبان حال سے یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر

پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

میں نے صفات کے ذکر کرنے میں درازنفسی سے کام لیا ہے، اور موصوف کو متعین نہیں کیا ہے، لیکن مجھے اطمینان ہے کہ ناظرین نے موصوف کو خود متعین کر لیا ہوگا، ہمارے ممدوح کی یہ صفات ان کا علم بن گئی تھیں، سراپا تواضع، مجسم بے نفسی، عبادت وریاضت کا پیکر حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ سے بڑھ کر کس کو دیکھا گیا ہے؟ مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کی خاک کس نے چھانی؟ امت کے لئے اس درجہ بے قرار کون رہا جیسے آتش زیرپا انسان بے قرار رہتا ہے، کس کی وفات کی خبر سن کر اہل سخن نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ برجستہ جگر کا یہ شعر دہرایا ؎

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

"ذکر الٰہی کرتے ہوئے لب، خشیت سے جھکی ہوئی آنکھیں اور معرفتِ ربانی سے مسکراتا ہوا چہرا اب کہاں دیکھنا نصیب ہوگا، جو مدارس کی گرمیِ محفل تھے وہ چلے گئے، جن کو دیکھتے ہی مسجدیں کھچا کھچ بھر جاتی تھیں وہ رخصت ہو گئے، جن کی مجلس میں بیٹھنے والا خود کو مالا مال سمجھتا تھا، اور جن کے قریب جگہ پانے والا پھولے نہیں سماتا تھا وہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے، نہ جانے کتنی مرتبہ ان کے پاس بیٹھ کر یہ شعر گنگنایا گیا ؎

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

(سہ ماہی فکر اسلامی: اشاعت خاص: صدیق نمبر: ۴۰-۴۸ مختصراً)

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ نے عجب علمی جامعیت سے بہرہ ور فرمایا تھا، معقولات ومنقولات دونوں پر یکساں دسترس رکھتے تھے، انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اللہ نے انہیں بہ یک وقت کئی دماغ عطا فرما دیئے ہیں، اور اب "کئی دماغوں کا ایک انسان" رخصت ہونے کے بعد ایسا خلا اور سناٹا در آیا

ہے جس کا پڑھونا بے حد دشوار ہے۔

منفرد تدریسی صلاحیت

تدریس ایک عظیم الشان عمل ہے جو بہ یک وقت علمی خدمت بھی ہے، افراد سازی اور مردم گری بھی ہے اور صبر آزما محنت بھی، اس میدان میں لوہا منوانے اور امتیازی مرتبہ پانے کے لئے جہدِ مسلسل، اخلاص ولگن، درشتی ونرمی کا متوازن امتزاج، فن، کتاب، مضمون اور اس کے جملہ متعلقات پر کامل عبور، سلاستِ بیان، دل نشیں پیرایۂ تفہیم، مشکل موضوعات کو بے حد آسان کر کے پیش کرنے کا ہنر، طولانی، الجھی ہوئی اور غیر مرتب بحثوں کو سہل، مرتب اور مختصر انداز میں بیان کرنے کا ملکہ اور ان جیسی متنوع صلاحیتوں کا حامل ہونا کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔

فیاضِ ازل نے حضرت مفتی صاحب مرحوم کو یہ تمام خوبیاں بہ درجۂ اتم عطا فرمائی تھیں، وہ جہاں رہے ان کے درس کی شہرت ومقبولیت زباں زدِ عام وخاص رہی، سالہا سال (غالباً آٹھ سال از ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۰ءؒ) انہوں نے از ہر ہند دار العلوم دیوبند میں مختلف علوم وفنون کی اہم کتابوں کا درس دیا، اور طالبان علوم نبوت ان کے دروس کے شیدا وفریفتہ رہے، ان کی بے مثال تفہیم اور دل نشیں انداز پر سر دھنتے رہے، راقم کا احساس ہے کہ انہوں نے تدریس میں جو خاص اور منفرد نہج خود اپنے ذوق، تجربات اور اجتہاد سے اختیار کیا تھا، بلا شبہ وہ اس نہج کے گویا موجد بھی تھے اور خاتم بھی، اس کی شہادت ان کے وہ تلامذہ بہ طور خاص دیتے ہیں جن کو تدریسی میدان میں کچھ خدمت انجام دینے کا موقع میسر آیا ہے۔

دار العلوم دیوبند کے قضیہ نا مرضیہ کے بعد ایسا لگتا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا دل بجھ سا اور طبیعت اچاٹ سی ہوگئی ہو، بالآخر انہوں نے دیوبند کو خیر باد کہہ کر اپنے وطن ''تمبور ضلع سیتاپور'' کی طرف رختِ سفر باندھا، اللہ کو ان سے وطن میں عظیم علمی خدمت لینی تھی، مدرسہ ضیاء العلوم تمبور ان کی علمی وتعلیمی خدمات کا مرکز بنا، اور علالت کا دورانیہ شروع ہونے سے پہلے تک کسی نہ کسی شکل میں اس ادارے سے وہ وابستہ رہے، اور جب تک باضابطہ وطن میں قیام رہا اور پورا وقت وہیں دیتے رہے،

اس ادارے کو مرکزیت اور مقبولیت کا بے حد لائقِ ستائش مقام حاصل رہا، حضرت مفتی صاحبؒ جن کسبی اور موہوب صلاحیتوں کے مالک تھے، ان کا بلند پرواز طائرِ علمی کسی ایک آشیانے پر کیسے اور کیوں کر قانع رہ سکتا تھا، بقولِ شاعر ؎

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

طالب العلمی کے دورانیے سے فراغت کے بعد سے علالت و مرض کے آغاز تک اپنے تدریسی سفر میں حضرت مفتی صاحبؒ نے متعدد علمی مراکز میں پڑاؤ ڈالا، کہیں بہت مختصر اور کہیں مختصر، کہیں چند ماہ اور کہیں ایک یا دو سال فیض رسانی کا سلسلہ جاری رہا، مگر ان کے پورے تدریسی سفر کے وقفوں اور منزلوں کا دیانتدارانہ تجزیہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ:

ان کی تعلیمی و درسی زندگی کے شباب و کمال کا آغاز از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کا قیام ہے، اور اس کا دوسرا مرحلہ وطن میں رہ کر ''مدرسہ ضیاء العلوم تمبور'' میں خدمت کا دورانیہ ہے، اور اس شبابِ علمی کا آخری اور اصل تکمیلی مرحلہ ''دارالعلوم الاسلامیہ بستی'' کی علم نواز اور بابرکت و پُر بہار فضا میں ایک دہائی سے زائد عرصے تک جاری رہنے والی ان کی تدریسی اور تعلیمی مصروفیت کا دور ہے۔

ان سطور کا راقم - حضرت مفتی صاحبؒ کے بے شمار تلامذہ کے ساتھ شاہد ہے کہ دار العلوم الاسلامیہ بستی کی درسگاہ میں جب ان کا درس بیضاوی ہوتا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ تفسیر و قرآنیات کا ماہر مفسر و عالم عقدہ کشائی کرتا جا رہا ہے، مضمون دلوں میں راسخ ہوتا جا رہا ہے، اور طالبین کا دامنِ مرادِ علمی جواہر پاروں سے لبریز ہوتا جا رہا ہے، اور جب درس حدیث کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اور مشکوٰۃ المصابیح کا سبق ہوتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت کا ایک محدث ''مسندِ مشیختِ حدیث'' پر جلوہ افروز ہے، اور ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں ڈوب کر کلامِ نبوت کی ایسی دل نشین شرح کر رہا ہے جو عالمانہ، محدثانہ اور فقیہانہ بھی ہے اور واعظانہ و داعیانہ بھی ہے، پھر جب وہ ''شرح نخبۃ الفکر'' پڑھاتے ہوئے اصولِ حدیث پر کلام کرتے تھے تو ان کی محدثانہ شان اور نکھر کر سامنے آتی تھی، اور طالب علم ان کے ''قال و حال'' دونوں کے سحر میں کھو جاتا تھا، پھر یہی معلمِ مثالی جب اسی

درسگاہ میں ''مختصر المعانی'' کا درس دیتا تھا تو انداز اس ماہر فن کا ہوتا تھا جو فن پر حاوی ہے، بلاغت کے اصول، نکتے، منثور و منظوم عربی فارسی و اردو تمثیلات کا تسلسل سامعین کو حیران و ششدر کئے رکھتا تھا، سنگلاخ مباحث آسان و دل نشیں تفہیم سے گویا پانی ہوجاتے تھے، اور کچھ وقفے سے جب ''دیوانِ متنبی'' کا سبق ہوتا تھا تو حضرت مفتی صاحبؒ ایک ادیبِ باکمال کے روپ میں نظر آتے تھے، اور ان کے ادیبانہ جوہر یوں کھلتے تھے کہ تشنہ کام طلبہ سیراب وشاداب اور آسودہ ونہال ہوا ٹھتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے ان کی ذات میں گویا ایک عالم جمع کر دیا تھا ؎

وَلَيْسَ عَلَى اللهِ بِمُسْتَنْكِرٍ
أَنْ يَجْمَعَ الْعَالَمَ فِيْ وَاحِدٍ

حضرت مفتی صاحبؒ کی تشریف آوری ''دار العلوم الاسلامیہ بستی'' میں وہاں کے علمی ماحول کے لئے ایک مژدۂ جاں فزا اور نوید بہار بن کر اس وقت ہوئی تھی جب ان سطور کا راقم درجہ عربی ہفتم میں زیر تعلیم تھا اور تعلیم کے آغاز پر کئی ماہ گزر چکے تھے، راقم کو مشکوۃ المصابیح جلد ثانی کا بیشتر حصہ، تفسیر بیضاوی کا ابتدائی داخلِ نصاب حصہ اور شرح نخبۃ الفکر ان سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

بے مثال اندازِ خطابت

حضرت مفتی صاحبؒ حقیقی معنوں میں ''خطیب العصر'' تھے، خطابت میں ان کا اپنا خاص لاثانی اسلوب وطرز تھا، ان کا خطاب علم وادب، نثر وشعر، استدلالی وتمثیلی ہر دو انداز اور مؤثر ترین حکایات و واقعات کی جامعیت کے لحاظ سے اپنی منفرد شان رکھتا تھا، اور اس پر مستزاد ان کی گھن گرج، آواز کا زیر وبم، لہجے کی حلاوت اور روانی، حسبِ موقع وحال جلال یا جمال کا اظہار، داعیانہ حکمت اور مجاہدانہ ولولے کا آمیزہ، آمد ہی آمد، آورد سے پاک، ایسا لگتا تھا کہ الفاظ ہاتھ باندھے دست بستہ التجا کر رہے ہیں اور حضرت مفتی صاحبؒ حسبِ موقع انتخاب کرتے جا رہے ہیں، کبھی ایسا لگتا کہ بلبلِ خوش نوا نغمہ سنج ہے، اور دلوں کو فتح اور دماغوں کو مسخر کرتا جا رہا ہے، اور کبھی یہ محسوس ہوتا کہ نبّاضِ امت امت کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے اور اپنے مجاہدانہ تیور کے ساتھ آگاہ وخبردار اور ہوشیار و بیدار کر رہا ہے۔

تقریریں خود مفتی صاحبؒ کی زبان میں:

''مقرر کا خونِ جگر، اس کے دل کی کڑھن اور اس کے بیتاب نالے ہوتے ہیں، ان میں روایت بھی ہوتی ہے اور جذبات و تاثرات بھی۔'' (دیکھنا تقریر کی لذت: ۱/ ۱۳، ۱۵)

حضرت مفتی صاحبؒ کے خطابات بلاشبہ ان کے دلِ بے تاب کی کڑھن اور ان کے خونِ جگر کا مقام رکھتے ہیں، عارف باللہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ نے حضرت مفتی صاحبؒ کے مجموعۂ تقاریر ''دیکھنا تقریر کی لذت'' کی تقریظ میں جو تحریر فرمایا ہے وہ بلاشبہ ایک عالمِ ربانی اور عارفِ کامل کی شہادتِ صدق ہے:

''اس وقت میرے سامنے تقریروں کا جو مسودہ ہے، اس میں دعوت بھی ہے، اصلاح بھی، تبلیغ بھی ہے اور سحر انگیزی بھی ہے، اللہ تعالیٰ کے کتنے بندے ان تقریروں سے راہ راست پر آگئے اور انہیں بہترین ذخیرۂ معلومات حاصل ہوگیا، یہ میرے عزیز بھائی اور مخلص رفیق مولانا مفتی شکیل احمد صاحب سیتا پوری کی تقریروں کا مجموعہ ہے، ان تقریروں کی دل پذیری اور خطاب کی سحر انگیزی کو بیان کرنا آفتاب کو چراغ دکھلانا ہے، موصوف ایک با صلاحیت صالح نوجوان اور عالم باعمل اور موثر اور دل میں اتر جانے والی تقریروں سے دعوت واصلاح کی خدمات انجام دے رہے ہیں، نیز مفتی صاحب دار العلوم الاسلامیہ بستی میں استاذ تفسیر وحدیث بھی ہیں، میں ان سے اور ان کی تقریروں سے واقف بھی ہوں اور متاثر بھی، ان تقریروں میں زورِ بیان اور دعوتِ نبوی کی روح جلوہ گر ہے، چند عناوین ملاحظہ ہوں ''شمع علم''، ''رحمت عالم''، ''فاتح اور پیغمبر کا فرق''، ''اتحاد و اتفاق'' اور ''اصلاح معاشرہ'' ان جیسے اور دوسرے عناوین پر مشتمل تقریروں کا یہ خوشنما گلدستہ ہے، ان تقریروں میں مفتی شکیل احمد صاحب دعوت اسلامی، فکر نبوی اور فن تقریر سے پورے طور پر واقف اور حامل نظر آتے ہیں، انہیں نبی اکرم ﷺ سے، آپ کی امت اور شریعت سے جذباتی تعلق بھی ہے، اور ان کا دل عشق الٰہی اور محبت نبوی سے لبریز بھی ہے، جس سے ان تقریروں کی تاثیر اور افادیت بڑھ گئی ہے۔'' (دیکھنا تقریر کی لذت: ۱/ ۱۰-۱۱)

حضرت مفتی صاحب کے خطیبانہ کمال کا عالم یہ تھا کہ جن اجلاسات اور کانفرنسوں میں وہ شریک

ہوتے تھے، وہی جانِ محفل اور رونقِ بزم قرار پاتے تھے، ان کے اسلوب کا سحر کرشماتی اثر رکھتا تھا، اصلاح معاشرہ کے موضوع پر حضرت مفتی صاحب کے خطابِ مستطاب کا ایک حصہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے، اس میں حضرت مفتی صاحب کے خطیبانہ تیور اور امتیازات کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں:

’’مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہمارے معاشرے پر جن ہاتھوں سے تباہی آئی ہے، ان میں ایک بڑا ہاتھ دولت مندوں کا بھی ہے، اکثر دولت مند فرعون بے سامان ہیں، وہ زمین پر پیر رکھتے ہی نہیں ہیں، ان کا دماغ ہمیشہ آسمان پر رہتا ہے، اللہ نے اگر چار پیسے دے دیئے ہیں تو گویا اپنی شیخی بگھارنے اور اپنا غرور نکالنے کا بہترین ذریعہ ہاتھ آگیا، وہ اپنی تقریبات اس طرح مناتے ہیں کہ غریبوں کی دل آزاری ہوتی ہے، اور ان کے لئے مشکلات پیدا ہوتی ہیں، شادی بیاہ میں جو دھوم دھام اہل دولت کرتے ہیں اس کی وجہ سے غریبوں کو اپنی تقریبات پھیکی معلوم ہوتی ہیں، شریعت میں نکاح کو آسان اور سستا بنایا گیا ہے تاکہ کوئی بالغ لڑکا اور بالغ لڑکی نکاح سے محروم نہ رہے۔

میرے بھائیو! جب نکاح عام ہوگا تو اس کا لازمی اثر یہ پڑے گا کہ زنا ناپید ہوگا، کیونکہ شادی شدہ جوڑا زنا میں بہت کم ملوث ہوتا ہے، لیکن ہائے افسوس، ہم نے نکاح کو مہنگا بنادیا، اتنا مہنگا بنادیا کہ اوسط درجہ کا آدمی بھی اس کے تصور سے کانپتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زنا ارزاں ہوگیا نہ جانے کتنے بالغ لڑکے اور لڑکیاں نکاح سے محروم ہیں اور وہ ناجائز طریقوں سے اپنی خواہشات کی تسکین کرتے ہیں ؎

جو تھا ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

میں اپنے دولت مند بھائیوں سے عرض کروں گا کہ جہیز بالکل غیر شرعی اور غیر اسلامی چیز ہے، اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بیٹی کو جہیز نہیں دیا، نہ حضرت زینبؓ کو، نہ حضرت رقیہؓ کو، نہ حضرت ام کلثومؓ کو، اور نہ حضرت فاطمہؓ کو، جو لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو جہیز دیا، وہ یہ کیوں نہیں بتاتے

کہ حضرت نے بقیہ تین صاحبزادیوں کو کیا جہیز دیا؟ اولاد کے درمیان امتیاز اور ترجیح برتنے سے آپ نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، تو کیا کوئی امتی یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ معلم اخلاق، امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اولاد کے درمیان تفریق برتی ہوگی، اور ایک بیٹی کو دوسری بیٹیوں پر ترجیح دی ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بیٹی کو کوئی جہیز نہیں دیا اور نہ شریعت میں اس کی کوئی بنیاد ہے، حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو جو مختصر سا سامان دیا گیا اس کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں تھے، ان کی ضروریات کا انتظام آپ ہی کے ذمہ تھا، اس لئے کفیل اور سرپرست ہونے کے ناتے آپ نے ان کے لئے بستر اور تکیہ اور چھاگل اور چکی وغیرہ کا انتظام فرمادیا اور وہ بھی اپنے مال سے نہیں، بلکہ انہیں کی زرہ فروخت کرواکر۔

بزرگو اور بھائیو! جہیز غیر شرعی چیز ہے، جہیز دشمنان اسلام کی دین ہے، جہیز ہمارے معاشرے کے لئے لعنت ہے، اس لعنت کو ختم کیجئے اور اس کی جگہ لڑکیوں کی وراثت کو رواج دیجئے۔ میراث میں ان کا حق ان کو پہنچایئے: ”ان الحسنات یذھبن السیئات“ نیکیاں، بدیوں کو دفع کردیتی ہیں، اگر وراثت کا فریضہ ادا کیا جائے گا تو اس کی برکت سے جہیز کی لعنت ختم ہوگی۔

حاضرین باتمکین! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کتاب وسنت جتنی مظلوم آج ہے اتنی مظلوم کبھی نہیں رہی، دونوں پکار رہے ہیں، کوئی جواب دینے والا نہیں ہے، جیسے نقار خانے میں طوطی کی آواز سنائی نہیں دیتی، اسی طرح ہوا وہوس اور رسم ورواج کے شور وغل میں قرآن و حدیث کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے، اس سے زیادہ مظلوم کون ہوسکتا ہے جس کی کوئی سننے والا نہ ہو؟

دوستو! کتاب الٰہی کی یہ بے وقعتی، احادیث رسول کی یہ بے توقیری کہ آپ اپنی خواہشات کے آگے ان کو قابل اعتنا بھی نہیں سمجھتے، اس گستاخی کے عذاب اور اس بے ادبی کے ادبار سے ہم کو کون بچا سکتا ہے؟ قرآن کریم نے ہم کو حکم دیا:

ولا تبذر تبذیرا، إن المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔

فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

ہم نے سنی ان سنی کردی، اِس کان سنا اُس کان اڑا دیا، اللہ تعالیٰ نے پکار کر کہا:

انہ لا یحب المسرفین۔

یقیناً اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، آپ نے کہا کوئی پروا نہیں، کلام ربانی نے رحمان کے بندوں کی ایک علامت یہ قرار دی:

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما۔

کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں بلکہ ان کا خرچ درمیانی ہوتا ہے، مسلمانوں نے کہا ہمیں رحمان کا بندہ بننے سے کوئی دلچسپی نہیں، لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ مسلم معاشرے میں سب سے زیادہ جو چیز مظلوم ہے وہ قرآن ہے، مسلمانوں نے سب سے زیادہ جس چیز سے بے التفاتی برتی ہے وہ اللہ کی کتاب ہے۔

حضارِ محفل! قوم کا فساد ہمارا فساد ہے، قوم کی نجات ہماری نجات ہے، اگر معاشرہ میں فساد ہے تو ہمارا گھر فساد سے محفوظ نہیں رہ سکتا، معاشرہ کو فاسد کرنے والوں اور اس پر خاموشی اختیار کرنے والوں کی سچی تصویر وہ ہے جو حدیث شریف میں کھینچی گئی ہے، ارشاد ہے کہ معاشرے میں جو لوگ گناہ کرتے ہیں ان کی مثال اور جو لوگ خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دومنزلہ کشتی ہے، اس میں کچھ لوگ اوپر کی منزل میں ہیں اور کچھ نیچے کی منزل میں ہیں، جو لوگ نیچے کی منزل میں ہیں ان کو دریا سے پانی لینے کے لئے اوپر کی منزل میں جانا پڑتا ہے، انہوں نے یہ سوچا کہ اوپر سے پانی لانے میں زحمت ہوتی ہے، لہٰذا نیچے ایک سوراخ کرلیا جائے، لہٰذا وہ کلہاڑی لے کر سوراخ کرنے لگے، اب اگر اوپر کے لوگ ان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور ان کو اس عمل سے باز رکھتے ہیں تو خود بھی سلامت رہیں گے اور ان کو بھی سلامت رکھیں گے اور اگر ان کو یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں تو دونوں ہلاک ہوجائیں گے۔

برادرانِ عزیز! زندہ قوموں کی یہی پہچان ہے کہ جب انہیں ہوش آئے تو بیٹھ کر اپنی

قسمت کو نہ روئیں، بلکہ سب ایک ہو کر کوشش کریں اور قوم کے دامن سے ذلت کا داغ دھوئیں، مدہوش کرنا کمال نہیں ہے مدہوش کو ہوش میں لانا کمال ہے ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

(دیکھنا تقریر کی لذت:۱/۲۱۸-۲۲۳)

وحدت، وسعت اور دعوت

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ نے داعیانہ مزاج و انداز عطا فرمایا تھا، وہ مناظرانہ انداز سے بالکل دور رہا کرتے تھے، امت کی وحدت کی بحالی، استحکام اور آبیاری ان کے فکر و عمل کی اولین ترجیح تھی، نزاع، محاذ آرائی اور تفرقہ بازی کی نفرت ان کے ہر ہر رگ و پے میں پیوست تھی، اللہ نے انہیں دینی غیرت و حمیت بھی خوب بخشی تھی، موقفِ حق پر صلابت و استقامت سے بھی نوازا تھا، مگر اس کے ساتھ ہی انہیں فکر و نظر کی وسعت بھی خوب خوب عطا ہوئی تھی، وہ فقیہ تھے مگر جمود و تعصب سے بالکل پاک تھے، مسلکی، مشربی اور فرقہ وارانہ تعصّبات کی تنگیوں سے منزہ تھے، ان کا تعلیمی سفر درس نظامی کے اداروں میں جاری رہا تھا مگر وہ روایتی اور رسمی انداز سے دور تھے، وہ حلقۂ دیوبند کے مستند ترجمان و نمائندہ تھے اور ان کی روِش "خذ ما صفا و دع ما کدر" اور حدیث نبوی "الکلمة الحکمة ضالة الحکیم حیث وجدھا فھو أحق بھا" کا کامل مصداق تھی۔

دعوت دین، اشاعتِ حق، اسلام کے رخِ صافی سے مغالطات کی دھند صاف کرنے اور تفہیم شریعت کے مشن اور کاز میں وہ کسی تعصب و تحزب کے بغیر ہر قابل ذکر مخلصانہ طور پر سرگرم قافلۂ حق و خیر کے معاون، رفیق اور باز و ثابت ہوتے تھے، اور یہ عمل وہ اپنا فرض سمجھ کر پورے شعور و دیانت داری کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

بلاشبہ وہ اتحاد امت کے داعی اور نقیب تھے، وہ علماء کو وحدتِ امت کے مشن کے ساتھ وابستہ اور محاذ آرائی سے نفور دیکھنا پسند کرتے تھے، اور جزئیات و فروعیات کی بنیادوں پر تفرقہ آرائی، مناظرہ بازی اور محاذ آرائی کی قباحت و شناعت کی طرف بار بار توجہ دلاتے تھے، اور ایسے ہر موقع پر ان کے

تیور سخت ہوجاتے تھے، اس سے وحدتِ امت کے تئیں ان کی فکر مندی اور حساسیت کا ظہور ہوتا تھا۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی سے ان کے اخلاف کو جو بنیادی پیغام ملتا ہے وہ یہی ہے کہ:

’’وحدت امت کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے، امت کو تفرقوں اور محاذ آرائیوں سے روکا جائے، وسعتِ قلب ونظر پیدا کی جائے، تنگ نظری، تحزب وتعصب کی لعنتوں سے اپنے کو پاک رکھا جائے، اور مناظرانہ مزاج کے بجائے داعیانہ مزاج بنایا جائے۔‘‘

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے وقت موعود پر اپنے حصے کا کام کر کے رخصت ہو گئے، رحمتِ الٰہی ان کی تربت پر ابر رواں کی صورت برستی رہے، آمین۔

علم وفن اور ادب وخطابت کی دنیا میں افراد آتے اور جاتے رہتے ہیں مگر حضرت مفتی صاحب کی رحلت سے جو مہیب خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید پر نہیں ہو سکے گا، آخری مرحلۂ حیات میں ان کے نحیف ونزار سراپا پر نظر پڑی تو یوں لگا کہ علم وفن کے اس چراغ کی لو بجھنے کو ہے اور وہ زبانِ حال سے یوں گویا ہے۔ ؏

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

○❖○

تقویٰ کی حقیقت

تقویٰ دل کی اُس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر وشر کی تمیز اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کرتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔

(حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ)

ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

از: مولانا مفتی محمد احمد قاسمی، ندوی استاذ تفسیر وحدیث دار العلوم الاسلامیہ بستی

باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے، اس دنیا کی ہر شخصیت، خواہ وہ کتنی دلکش، کتنی پُر بہار، کتنی ہر دل عزیز اور کتنی زندگی افروز ہو بالآخر اُسے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہے، آگے اور پیچھے کا فرق ضرور ہے لیکن ہم میں سے کون ہے جو یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے آیا ہو "کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ" (سورۂ رحمٰن:۲۶) اور "وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ" (سورۂ لقمان:۳۴) اٹل قرآنی حقائق ہیں، جن کے انکار کی کوئی کٹر دہریہ بھی جسارت نہیں کرسکا ہے، مگر کچھ ایسی باغ وبہار، باکمال وباصلاحیت اور متأثر کن شخصیات ہوا کرتی ہیں جن کی جدائی دلوں کو بے کل اور بے چین کردیا کرتی ہے اور کچھ ایسے علوم شرعیہ کے حامل ہوا کرتے ہیں کہ جن کی وفات ''قبضِ علم'' کو مجسم ومحسوس شکل میں نمایاں کردیا کرتی ہے۔

ہمارے استاذ گرامی قدر، تدریس وخطابت کی دنیا کے رموز آشنا حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ کا سانحۂ وفات بھی ان ہی صفات کی حامل ایک عظیم شخصیت کا رخصت ہوجانا ہے، ان کی وفات نے علم دین، زبان وادب، تدریس وخطابت کی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا کیا کہ جس کے پُر ہونے کی بظاہر کوئی شکل نظر نہیں آتی ہے ع

دور تک قافلۂ صبح کے آثار نہیں

حضرت الاستاذؒ کی نمازِ جنازہ میں علماء اور طلبہ کی کثرت ان کی مقبولیت وبخشش اور رفعِ درجات کی نمایاں علامت ہے۔

دار العلوم الاسلامیہ بستی کی انجمن اصلاح البیان کے سالانہ جلسوں میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے حضرت مفتی صاحبؒ کی آمد اور شرکت سے ہمارا اُن سے تعارف ہوا اور ان کی علمی عظمت اور پُر مغز البیلے اندازِ تقریر وخطابت کا سکہ دلوں پر قائم ہوا اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا ہی چلا گیا،

ہم درجہ عربی چہارم میں زیر تعلیم تھے، دار العلوم الاسلامیہ بستی میں اسی سال درجہ عربی ہفتم کا قیام عمل میں آیا تھا، ماہ محرم الحرام کے بعد اسی جماعت کی تدریس کے لئے حضرت مفتی صاحبؒ کی بستی تشریف آوری ہوئی اور مفتی صاحبؒ کی آمد سے طلبہ اور اساتذہ میں ایک نشاط، ولولہ اور علمی ذوق وشوق تازہ ہوگیا اور دار العلوم الاسلامیہ بستی کے چمنستانِ علمی میں ایک بہار آ گئی، حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریروں کے مختصر مجموعہ ''گوہر علم جوہر سیرت'' سے اپنے اساتذۂ کرام کی رہنمائی میں استفادہ کی سعادت حاصل ہوچکی تھی، گویا غائبانہ تعارف پہلے ہی سے تھا، حضرت مفتی صاحبؒ کی خطابت کسبی سے زیادہ وہبی اور خالصۂ فضلِ الٰہی اور عطائے ربانی معلوم ہوتی تھی، طرزِ استدلال، اشعار کا برمحل استعمال، واقعات کو البیلے انداز میں پیش کرنا، سامعین کو مکمل اپنی طرف متوجہ رکھنا اور ان کے دلوں کو اپنے قبضہ میں کر لینا، موقع محل اور مخاطبین کی نفسیات اور مزاج و مذاق کا بھرپور خیال رکھنا یہ سب توفیقِ ربانی ہی کا ثمرہ تھا۔ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ہم اصول فقہ کی کتاب ''اصول الشاشی'' میں ایک جگہ استاذِ گرامی قدرؒ سے کچھ سمجھنے کے لئے حاضر ہوئے، انہوں نے اس طرح سمجھا دیا کہ بات بالکل ذہن میں بیٹھ گئی اور اُسی موقع پر یہ بھی فرمایا تھا: مذاق جہالت کی نشانی ہے اور سورۂ بقرہ کی اس آیتِ کریمہ سے استدلال کیا تھا جب حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے اللہ کے حکم گائے ذبح کرنے کے بارے میں بتایا تو قوم کہنے لگی: ﴿أَتَتَّخِذُنَا هُزُواً؟﴾ کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟ ﴿قَالَ أَعُوذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ حضرت موسیٰؑ نے کہا: میں اس سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ جاہلوں جیسا کام کروں۔ (سورۂ بقرہ: ۶۷)

حضرت مفتی صاحبؒ کی بستی تدریس کے پہلے سال میں باضابطہ ہمارا سبق مفتی صاحبؒ کے پاس نہ تھا اور مفتی صاحبؒ نے صرف تین اسباق پڑھانے پر رضامندی ظاہر کی تھی، مگر اگلا سال ہمارا عربی پنجم کا تھا، ماہِ شوال میں دادا محترم حضرت مولانا محمد باقر حسین نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے فرمایا کہ: آپ کی ''مختصر المعانی'' کی تدریس دار العلوم دیوبند میں بڑی مشہور تھی، ہماری

خواہش ہے کہ اس سال آپ اُسے پڑھا دیں، حضرت الاستاذ بے تکلف وبغیر کسی تردد کے راضی ہوگئے اور تین کے بجائے چار اسباق پڑھانے لگے، مختصر المعانی، تفسیر بیضاوی، مشکوٰۃ المصابیح اور دیوان متنبّی، اب مفتی صاحبؒ سے براہِ راست اور باضابطہ استفادہ کا سلسلہ شروع ہوا، پورے سال کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ مختصر المعانی بھی کوئی مشکل کتاب ہے یا اس میں کوئی مشکل بحث بھی ہے، مکمل گھنٹہ پڑھانے اور دورانِ درس طلبہ کو نشیط اور متوجہ رکھنے کا خاص فن اور بات سمجھانے کا خاص ملکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ودیعت کر رکھا تھا، عبارت طلبہ سے پڑھوا کر جامع، سہل ترین، دلنشیں تشریح اور اردو اشعار سے بھی وضاحت فرمانے کے بعد عبارت خواں ہی سے ترجمہ بھی کرایا کرتے تھے، الحمدللہ! مختصر المعانی میں خوب عبارت پڑھنے، ترجمہ کرنے اور سیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد درجہ عربی ششم میں ''دیوانِ متنبّی'' پڑھنے کا شرف ملا، ہمارے درسی ساتھی مولانا امانت اللہ صاحب بہرائچی خوش الحانی اور ترنم کے ساتھ اس کے اشعار پڑھتے، پھر لغات اور شاندار مطلب خیز ترجمانی طبیعتوں میں نشاط پیدا کر دیا کرتی تھی، مستقل اس کے نوٹس ہم نے قلمبند کئے اس کے بعد کے سالوں میں حضرت مفتی صاحبؒ نے اُن پر ایک نظر ڈال کر اس کو مستند و معتبر بھی بنا دیا تھا، جب تدریسی زندگی میں دیوانِ متنبّی پڑھانے کا موقع ملا تو ان نوٹس اور کاپیوں نے تمام شروحات و متعلقات سے بے نیاز کر دیا اور اب معلوم ہوا کہ کتنی عربی شروحات کا خلاصہ ان کاپیوں میں قید تھا۔

درجہ عربی ہفتم میں تفسیر بیضاوی اور مشکوٰۃ المصابیح جزء ثانی پڑھنے کی سعادت ملی، حضرت مفتی صاحبؒ نے تفسیر بیضاوی تو دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت مولانا فخر الحسن صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے پڑھی تھی جن کے آپ محبوب شاگرد تھے اور جن کے درسی افادات بھی ''التقریر الحاوی'' کے نام سے آپ نے جمع فرمائے تھے، اس لئے تفسیری نکات اور بطور خاص عبارت کے ایک ایک جزء کی تشریح آپ کے درس تفسیر کی خصوصیت تھی، مشکوٰۃ المصابیح عشقِ نبوی اور عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کے جذبات سے لبریز ہوکر ہی پڑھاتے تھے اور ذہنی وسعت وآفاقیت کی دعوت کے ساتھ روحِ حدیث کے سمجھنے پر زور دیتے، نہ کہ فقہی مسالک کی ترجیحات پر، مگر جب بھی اس سلسلے کا کوئی سوال کیا جاتا تو مفصل جواب بھی عنایت فرماتے اور یہ رہنمائی بھی کہ اس سلسلے میں ملا علی قاریؒ کی ''مرقاۃ المفاتیح'' کافی ہے، مراجعہ کرلو۔

انجمنوں کے تقریری وتحریری نظام کی افادیت کے سلسلے میں ہم طلبہ سے فرمایا کرتے تھے کہ اس میں ذوق وشوق اور دلچسپی کا بڑا دخل ہوا کرتا ہے اور میں نور العلوم بہرائچ کی طالب علمی کے دور سے ہی تقریر کی مشق کیا کرتا تھا اور مجھے اس سے بڑی دلچسپی تھی، اس طرح ہم شاگردوں کو مہمیز کرتے تھے۔

مفتی صاحبؒ کا حافظہ غضب کا تھا، استحضارِ علمی مثالی تھا، مجھے یاد ہے کہ ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں مسجد میں طلبہ کی سستی اور سنتوں میں تکاسلی محسوس کرتے ہوئے سخت انداز میں سرزنش کی اور اس موقع پر کھڑے کھڑے ارتجالاً ''مراقی الفلاح'' اور ''فتح القدیر'' کی عبارت آدھے آدھے صفحہ تک پڑھی اور لہجہ شفقت بھری سختی لئے ہوئے تھا، اس سے استحضار علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

رسوخِ علمی، وسعت وگہرائی اور نبوغ آپ کی شخصیت کا لازمہ تھا، مطالعہ کے سلسلے میں فرماتے: میں ہر رطب ویابس کا مطالعہ نہیں کیا کرتا، بلکہ مصادر اور امہات الکتب مطالعہ میں رکھتا ہوں، اور جلدی جلدی نہیں کرتا مطالعہ اس طرح ہو کہ کچھ حافظہ میں محفوظ رہ جائے ورنہ کیا فائدہ ہے؟ مطالعہ کے بڑے شوقین تھے، دیر رات تک مطالعہ کا سلسلہ جاری رہا کرتا تھا، نمازوں کی پابندی کا بڑا اہتمام تھا، بطور خاص صلاۃ اوابین اور صلاۃ ضحیٰ مفتی صاحبؒ کے معمولات میں شامل تھیں اور کبھی فرماتے کہ: نماز ہی تو ایک چیز ہے جسے لے کر جانا ہے اور پیش کرنا ہے بارگاہ رب العالمین میں۔

حفظانِ صحت کے اصولوں پر بھی حضرت مفتی صاحبؒ سختی سے عمل کیا کرتے تھے، دوپہر میں برائے نام کچھ نوش کرتے، شام کا کھانا بعد مغرب ہی تناول کر کے اہتمام سے چہل قدمی کرتے تھے، پھلوں میں سیب بطور خاص پسند کرتے تھے، چائے نوشی کے بڑے شوقین تھے اور اس کے آداب سے بھی واقف وآگاہ، عام طور پر اپنے ہی ہاتھوں سے چائے بنا کر خود بھی پیتے اور دوسروں کو بھی پلاتے۔

خرد نوازی اور حوصلہ افزائی مفتی صاحبؒ کی خاص صفات تھیں، چنانچہ سعودی عرب میں تعلیم کے زمانہ میں سالانہ تعطیلات میں ہم آتے اور حضرت والد ماجد دامت برکاتہم کی ہدایت پر دار العلوم الاسلامیہ بستی کی مسجد میں جمعہ کے بیانات اور خطبوں کا موقع ملتا تو حضرت مفتی صاحبؒ جس جمعہ میں موجود ہوتے اس میں بڑی ہی حوصلہ افزائی فرماتے اور ہمت بڑھاتے، ایک مرتبہ ہم نے علامہ محمد امین شنقیطیؒ کی تفسیر ''اضواء البیان'' کے حوالے سے کوئی بات ذکر کی تو مفتی صاحبؒ نے بعد نمازِ عصر بڑی ہمت بڑھائی اور فرمایا کہ: ''قرآنیات کو اپنا موضوع بناؤ اور اس طرح علمی نکات وفوائد جمع

کر کے بیانات کے لئے رکھو اور مختصر نوٹس بھی تیار کرتے رہو، یہ کام آتے ہیں''۔ اب کہاں ایسے مشفق اساتذہ اور ایسے مخلص مربی حضرات رہے، اگر ہم یتیمی کا احساس نہ کریں تو کون کرے؟ ع

اب ڈھونڈھ انہیں چراغِ رخِ زیبا لے کر

استاذِ محترم کی تدریسی زندگی کا سب سے لمبا دورانیہ الحمدللہ دارالعلوم بستی ہی کا رہا ہے، جس میں وہاں کے پُرسکون علمی ماحول، ذہنی آزادی اور طلبۂ عزیز کی دلچسپی اور مخلص رفقائے اساتذۂ کرام کا دخل تھا ہی وہیں بانیٔ ادارہ حضرت اقدس مولانا محمد باقر حسین نوراللہ مرقدہٗ کی غایت توجہ، حسنِ اخلاق اور حددرجہ اکرام واعزاز کے رویہ کا بھی۔ ؎

وکل امرئ یولی الجمیل محبب

وکل مکان ینبت العز طیب

(اور ہر احسان نواز انسان محبوب ہوا کرتا ہے، اور ہر عزت اگانے والی جگہ عمدہ ہوا کرتی ہے)

مختلف اکابر علماء کی زبانوں سے ہم نے یہ سنا کہ حضرت مفتی صاحبؒ جیسے باکمال وباصلاحیت شخصیت کے اس طویل قیام کا سبب حضرت مولانا محمد باقر حسین نوراللہ مرقدہٗ کی بلند اخلاقی اور دلنوازی ہی تھی، مفتی صاحبؒ نے جہاں دارالعلوم بستی کے تعلیمی نظام کو عروج بخشا وہیں اس کے تعارف کے حلقہ کو بھی وسعت دی، اور ملک کے مختلف گوشوں میں دارالعلوم بستی کے تعارف، شہرت اور نیک نامی میں حضرت مفتی صاحبؒ کے کردار اور ان کی کاوشوں کو ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے، بانیٔ مدرسہ حضرت مولانا محمد باقر حسینؒ کے سانحۂ وفات کے بعد قیمتی تأثراتی مضمون بھی مفتی صاحبؒ نے قلمبند فرمایا تھا۔

جب حضرت مفتی صاحبؒ نے دارالعلوم بستی سے یکسوئی کا فیصلہ کیا تو راقم کو دو ہفتوں تک مشکوٰۃ المصابیح اور مختصر المعانی کی تدریس کا موقع ملا، مجھے یاد ہے کہ مفتی صاحبؒ نے مختصر المعانی کے سلسلے میں بنیادی رہنمائیاں عطا کیں اور حاشیہ کو خوب اچھی طرح حل کر کے خوبصورتی سے پیش کرنے اور حل عبارت کے کچھ نکات بھی بتائے۔ ہدایہ کے سلسلے میں فرماتے کہ: صاحبِ ہدایہ بہت بڑے منطقی ہیں، جس کو منطق سے اچھی مناسبت ہو اُسے ہدایہ پڑھانا چاہئے تاکہ دلیلوں کا تجزیہ کرسکے کہ کبھی صغریٰ حذف کردیتے ہیں اور کبھی کبریٰ اور کبھی صرف نتیجہ ذکر کرتے ہیں، اور تفسیر

جلالین کے سلسلے میں فرماتے کہ: اس میں نحو کا پہلو بہت غالب ہے، جو نحو میں درک رکھتا ہو وہ اس کی عبارتیں کماحقہ حل کر سکے گا۔

تواضع، انکساری اور سادگی ان کی طبیعت تھی، اپنے کپڑے بھی عام طور پر اپنے ہاتھوں سے خود ہی دھل لیا کرتے تھے، موقع محل کی رعایت، برمحل گفتگو اور مخاطبین کی نفسیات وذہنیت کے بھانپ لینے کا خداداد ملکہ ان کو ودیعت ہوا تھا اور عصر بعد کی ان کی علمی مجلسیں، علمی لطائف وظرائف طبیعتوں میں بہار اور تمام فکروں کا ازالہ اور غموں کو غلط کر دیا کرتی تھیں، ان کی خطابت وتقریر کا البیلا انداز کانوں میں رس گھول کر دلوں کو متاثر کرتا تھا، فقیہ ملت حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام نور اللہ مرقدہٗ آل انڈیا ملی کونسل کا ایک ''ملی کارواں'' لے کر بستی تشریف لائے، قاضی صاحبؒ کا خطاب کے بعد بہرائچ کا پروگرام تھا، حضرت مفتی صاحبؒ بھی حضرت والد ماجد زید مجدہم کو لے کر بہرائچ تشریف لے گئے، ہم کو بھی ہم رکابی کا شرف ملا، وہاں مفتی صاحبؒ کے ایمان افروز، حوصلہ افزا خطاب نے دلوں کو گرما دیا اور مایوسیوں کے ماحول میں امید وحوصلہ کی شمع روشن کر دی، وہ جوش وولولہ اور آیات واحادیث مبارکہ کا استحضار اور برمحل مستند اشعار، بس آمد ہی آمد تھی اور ''از دل خیزد بردل ریزد'' کا مصداق تھا ؎

زمزموں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ آواز اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

سیرتِ نبویہ پر حضرت مفتی صاحبؒ کی ایک شاہکار تقریر آج بھی ہمارے ذہنوں میں رقص کرتی ہے جس میں مفتی صاحبؒ خاص انداز سے نبی اکرم ﷺ کی عظمت کا تذکرہ کرتے کہ آپ ﷺ کی انگلیاں بتاتی ہیں کہ نبی کی انگلیاں ہیں اور قدم بتاتے ہیں کہ نبی کے قدم ہیں، اسی طرح توحید خالص کے موضوع پر ایک خطاب جس میں یہ ذکر فرماتے کہ اللہ کو پہچانا گیا شہتوت کے پتوں سے اور ایک اعرابی کے یہ جملے نقل کرتے: "البعرة تدل على البعير، وآثار الأقدام تدل على المسير، فسماء ذات أبراج، وأرض ذات فجاج، وبحار ذات امواج، كيف لاتدل على اللطيف الخبير"؟

حضرت مفتی صاحبؒ کی حیات میں کئی بار ان کی وفات کی خبر آئی، ان کی اہلیہ کی وفات ہوئی تو

بھی یہ خبر آئی کہ مفتی صاحبؒ اللہ کو پیارے ہوگئے، ہم نے موبائل پر رابطہ کیا، مفتی صاحبؒ سے گفتگو ہوئی، نڈھال اور غمگین معلوم ہورہے تھے، تعزیتی کلمات کہے اور ملاقات کا وعدہ ہوا۔

اخیر سالوں میں امراض کی شدت اور اہلیہ کی وفات نے مضمحل اور کمزور کردیا تھا، ملاقات وعیادت کے لئے لکھنؤ گھر پر حاضری ہوئی تو وہ ذہانت، حاضر جوابی، استحضار علمی اور باغ و بہار کیفیت سب رخصت سی نظر آئی، دلی صدمہ ہوا اور یہ یقین کہ ہر تغیر اور زوال سے پاک صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کی ذات ہی ہے اور اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔

ان کے صاحبزادوں سے رابطہ تھا، علالت کی شدت کی خبریں آرہی تھیں، کلکتہ میں اپنے بڑے فرزند کے پاس زیر علاج تھے، چند دن قبل ایئر ایمبولینس کے ذریعہ لکھنؤ تشریف لائے، بالآخر علم وفن، فضل وکمال، تدریس وخطابت کا یہ شہسوار، کیف علم اور سوزِ عشق کا جامع، حمیتِ ایمانی اور غیرت دینی کا حامل، علمی گہرائی اور گیرائی اور ذوق علمی کا یہ بدر منیر غروب ہوگیا اور شہر نگاراں لکھنؤ کے عیش باغ کے قدیمی قبرستان میں آسودۂ خواب ہوگیا۔

ہم نے باچشم پُرنم آخری دیدار کیا، جسم بہت ہلکا پھلکا ہوچکا تھا، علالت وبیماری نے لاغر ونحیف کردیا تھا، مگر چہرہ، ایمان ویقین اور علم وفضل کے نور سے منور نظر آرہا تھا ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تونے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

ربِ کریم استاذِ گرامی قدر کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے تلامذہ اور فیض یافتگان کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے اور رشد وہدایت اور علم وعمل کے جو چراغ وہ جلا گئے اُسے ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

اللهم اغفر له وارحمه واكرم نزله ووسع مدخله وأبدله داراً خيراً من داره وأهلاً خيراً من اهله ونقّه من الخطايا كما يُنقىّ الثوب الأبيض من الدنس وبلغه الدرجات العلى من الجنة. (آمین)

❁❁❁

ایک نامور معلم وخطیب
حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ

از: مولانا محمد رفیق قاسمی بستوی استاذ معہد التخصص فی اللغۃ العربیۃ، جوگا بائی جامعہ نگر، نئی دہلی

دار العلوم الاسلامیہ بستی کے اربابِ حل وعقد نے غالباً اپنے قدیم مایۂ ناز معلم وخطیب واستاذ محترم حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری نور اللہ مرقدہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے ادارہ کے ترجمان فکر اسلامی میں تذکرہ کا مستحسن ارادہ کیا ہے اور مجھے بھی از راہِ ہمت افزائی مکلف کیا ہے کہ میں بھی مختصراً کچھ قلمبند کروں یہ اقدام قابل تقلید وستائش ہے کیونکہ اس سے عہد رفتہ کا اعتراف اور دورِ آئندہ کی آبیاری کا سامان فراہم ہوتا ہے۔

نامور معلم اور خطیب

میرے ذہن میں یہ عنوان حضرت مفتی صاحبؒ کی جامع الکمالات شخصیت کا آئینہ دار ہے اور ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کے سوزِ دروں کا عکاس ہے، انھوں نے نہ جانے کس فکرمندی اور دردمندی سے اپنے رب کو پکارا تھا" رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ‌ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ"(البقرہ:۱۲۹)

ترجمہ :اے ہمارے رب: اور ان کے درمیان انھیں میں سے ایک رسول بھیج جو اُن پر تیری آیتوں کی تلاوت فرمائے اور انھیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے اور انھیں خوب پاکیزہ فرمادے۔ بلاشبہ تو ہی ہے قدرت والا، کامل انتظام کرنے والا۔

رب کائنات نے کربِ ابراہیمی کے مداوا کے لیے کائنات کا معلم ان کی گود میں ڈال دیا جس نے اس فیضانِ باری کا اعلان ان الفاظ میں کیا"إنما بعثت معلماً" یعنی اللہ نے مجھے بطورِ معلم نبوت ورسالت سے سرفراز کیا اور آپ ﷺ نے کارِ تعلیم کو اس صداقت وامانت کے ساتھ سرانجام دیا کہ یہ تیرہ وتاریک دنیا زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوکر قیامت تک کے لیے روشن وتابناک اور منور ہوگئی اورنسلِ انسانی کے لیے ایک واضح صراط مستقیم کی ضمانت بن گئی۔ ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

حیاتِ انسانی کے ہزاروں، لاکھوں بلکہ ناقابلِ شمار مشاغل میں علی الاطلاق کوئی بھی مشغلہ مشغلۂ تعلیم جیسا پاکیزہ اور حیات بخش نہیں ہے، ہمارے ملک ہندوستان کے سابق صدر جمہوریہ اور فادر آف میزائل ٹکنالوجی اے پی جے عبد الکلام نے کہا ہے کہ" قوموں کے مستقبل کی تعمیر درسگاہوں میں ہوتی ہے"اور بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ تعبیر ہر زمان ومکان اور ہر خطۂ ارض کے لیے صد فیصد درست ہے۔

مفتی صاحبؒ بلاشبہ اسی زمرۂ تعلیم کی ایک مسلسل اور متواتر کڑی تھے اور تمام عمر از اول تا آخر اسی سلسلہ سے مربوط ومنسلک رہے۔

ان کی حیات وخدمات پر طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدبر کائنات نے ان کا انتخاب اسی مقدس فریضۂ تعلیم کی ادائیگی کے لیے کیا تھا، تجربات اور مشاہدات بتاتے ہیں کہ قدرت اگر کسی مقصد کے لیے کسی کا انتخاب کرتی ہے تو اس کے اسباب فراہم کردیتی ہے اور اس چیز کو اس کے لیے آسان بنادیتی ہے۔انھیں خداداد ذکاوت وذہانت کے ساتھ آغازِ طفولت سے ہی تعلیم سے گہری دلچسپی تھی اور بحیثیت طالب علم بھی وہ ہمیشہ نہایت نمایاں اور ممتاز رہے، ان کا یہ امتیاز ایشیا کی سب سے عظیم دینی درسگاہ مادرعلمی دارالعلوم دیوبند میں بھی قائم رہا۔وہ اپنے ہم درس اور ہم عصر طلبہ میں ایک نیر تاباں تھے، اسی خداداد طباعی اور صلاحیت کا ادراک کرتے ہوئے انتظامیہ اور اساتذۂ ام المدارس دارالعلوم دیوبند نے فراغت کے ساتھ ان کا بحیثیت استاذ وہاں تقرر کرلیا مگر بوجہ کم سنی انھوں نے کچھ عرصہ قرب وجوار کے ایک ادارہ میں گزارا اور "بسطة في العلم والجسم"

(البقرہ:۲۴۷)''اور اسے علم اور جسم میں کشادگی بخشی''۔کی شرط پوری ہونے کے بعد دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور تقریباً ایک دہائی وہاں مصروفِ تعلیم وتدریس رہے بعد ازاں جشنِ صد سالہ کے بعد تقسیم دارالعلوم دیوبند کا سانحہ پیش آیا جس نے وابستگان دارالعلوم دیوبند اور بہی خواہان ملت اسلامیۂ ہندیہ کو ایک مسلسل کرب میں مبتلا کر دیا، علماء کرام اور مسلم عوام کے مابین ایک خلیج پیدا ہوگئی ارباب انتظام اور اساتذۂ کرام دو دھڑوں میں ہمیشہ کے لیے منقسم ہوگئے۔

اِس بلائے بے اماں میں مفتی شکیل احمد صاحبؒ نے مادرِ علمی کو خیر باد کہنے میں عافیت سمجھی اور دوسرے اداروں سے مربوط رہے۔اسی عرصہ میں اربابِ انتظام دارالعلوم الاسلامیہ بستی نے ان سے رابطہ کیا اور انھیں بغرض تدریس بستی لے آئے جہاں وہ گیارہ سال مصروفِ تدریس رہے۔ بلاشبہ مفتی صاحبؒ کی مضبوط علمی لیاقت اور طاقتور شخصیت سے دارالعلوم الاسلامیہ بستی کو بہت فیض پہنچا۔

ایک کامیاب اور با مقصد معلم میں دو وصف ضروری ہیں اول یہ کہ: وہ خود باصلاحیت ہو اور جو تدریسی امور اس سے متعلق ہوں ان کا جانکار اور ماہر ہو اس لیے کہ وہ اگر اپنے کام سے آشنا نہیں ہے تو مطلوبہ نتیجہ کبھی برآمد نہ ہوگا۔دوم اسے کارِ تدریس سے دلچسپی ہو:اس لیے کہ اگر دلچسپی نہیں ہے تو وہ اپنے فرائض کبھی بھی صحیح طریقہ سے انجام نہ دے سکے گا اور اس کا نتیجہ طلبہ کی زندگی کی بربادی ہوگا مفتی صاحبؒ بلاشبہ اُن اساتذہ میں سے تھے جن کی تدریس سے صلاحیتیں اور شخصیتیں بنتی ہیں اور غالباً اب ایسے لوگوں کی حلقۂ تدریس میں بھی بہت کمی ہوگئی ہے۔

میرے خیال میں فریضۂ تدریس نہایت نازک اور عظیم امانت ہے، اس سلسلہ میں بہت دیانت کی ضرورت ہے ہمارے ایک دوست ایک بار کہنے لگے کہ فیلڈ میں معتبر اور باصلاحیت علماء بہت کم یاب ہیں یہ صورت حال تشویشناک ہے۔ہمارے اسلاف واکابر نے بہتر تعلیم وتربیت کو ملت کی بقا اور دفاع کے لیے نہایت مؤثر آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا اور انھیں اللہ نے توقع سے زیادہ کامیابی بخشی ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی، بہت زرخیز ہے ساقی

مفتی صاحبؒ کو اللہ نے تدریس وتقریر دونوں صلاحیتیں بخشی تھیں وہ جتنے کامیاب مدرس تھے

اتنے ہی کامیاب مقرر بھی تھے اس طرح ان کا دائرۂ فیض بہت بڑا تھا، طلبہ درسگاہ میں ان سے کسبِ فیض کرتے اور عام لوگ اسٹیج سے ان سے فائدہ اٹھاتے، انھوں نے فنِ خطابت کی مہارت کے لیے وسیع مطالعہ اور کڑی محنت کی تھی، میں نے زمانۂ طالب علمی میں دارالعلوم دیوبند میں انھیں دیکھا تھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک ضخیم نوٹ بک ہوتی تھی اور وہ اس کا مطالعہ کرتے رہتے تھے، ظاہر ہے کہ بلا کڑی محنت اور مشق کے کسی بھی صلاحیت میں نکھار کبھی نہیں پیدا ہوتا چنانچہ اس کا نتیجہ تھا کہ خطابت بہت پر مغز، معلوماتی، مؤثر اور حوالوں واشعار وغیرہ سے پُر ہوتی، خطابت میں روانی، معلومات کی فراوانی، نشیب وفراز اور واقعات کا زیر و بم ہوتا۔

دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں قیام کے دوران انھوں نے ذمہ داران کی فرمائش پر برادرِ عزیز مولانا محمد اسعد قاسمی ناظم دارالعلوم الاسلامیہ کے ہمراہ ریاض سعودی عرب کا سفر کیا، اس موقع پر ریاض شہر میں ان کا ایک عمومی پروگرام رکھا گیا تھا، ہال برادرانِ وطن سے کچھا کھچ بھرا ہوا تھا، مفتی صاحبؒ نے اس موقع پر حسبِ عادت شاندار تقریر کی اور آخر میں تقریر کا ماحصل پیش کرتے ہوئے فرمایا جس کا مفہوم یہ تھا ''ہمیں اقوامِ مغرب سے سائنس اور ٹیکنالوجی لینی چاہئے عقیدہ اور عمل نہیں''

سامعین بے حد محظوظ ہوئے اور خوب ستائش ہوئی وہ اپنی خطابت سے موضوع اور مجمع پر چھا جاتے تھے، بقول جوش ملیح آبادی ؎

خَلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں چھا جاتا ہوں میں

سدا بہار شخصیت:

مفتی صاحبؒ اپنے سراپا کے لحاظ سے میانہ قد وقامت، سانولی رنگت، معتدل جسم، تخلیقی طور پر بقدر ضرورت داڑھی اور خوش پوشاک انسان تھے عام طور پر شیروانی اور ٹوپی زیب تن فرماتے اور عالمانہ رکھ رکھاؤ کے علاوہ عمومی زندگی اور نشست وبرخاست میں بالکل چست ودرست، کاہلی وکسل مندی سے پوری طرح گریزاں نظر آتے، طبیعت میں شرافت اور ملنساری، گفتگو میں سادگی، شائستگی اور برجستگی تھی۔

ذاتی حصولیابیوں کے اعتبار سے ان کے ساتھ بہت سی عظمتیں اور نیک نامیاں وابستہ تھیں مگر

بایں ہمہ وہ ہر طرح کے کروفر، جاہ وجلال، پرُ تکلف تمکنت اور مصنوعی وقار سے بالکل بے نیاز، ہمہ وقت ہشاش وبشاش، احباب کی دلبستگی کے لیے تیار گویا سراپا باغ و بہار۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شرفِ تلمذ:

میں اس کو خوبی قسمت سمجھتا ہوں کہ دار العلوم دیوبند میں مجھے ان سے شرفِ تلمذ بھی حاصل ہوا تھا، قصہ یہ ہوا کہ ابتدائی جماعتوں کی تعلیم میں نے تاؤلی ضلع مظفر نگر میں حاصل کی، سال چہارم میں میرے کچھ گھنٹے خالی تھے جن میں میں نے سال پنجم کی کچھ کتابوں کی سماعت کرلی اور اگلے سال بغرض داخلہ دار العلوم دیوبند آنے کے بعد سال چہارم کا امتحان دینے کے بجائے سالِ پنجم کا امتحان دے کر مطلوبہ سال ششم رکھا مگر پنجم کی دو کتابیں ملا مبین اور میبذی میں نے پڑھی نہ تھیں، ممتحن حضرت مولانا فخر الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ تھے، انھوں نے الحمد للہ بہت اچھے نمبروں سے پاس کر دیا اور یہ دونوں کتابیں پڑھنے کے لیے خارج میں کر دیں، ان میں میبذی استاذ محترم حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ پڑھاتے تھے اور ملا مبین حضرت مولانا زبیر احمد صاحبؒ کے سپرد تھی وہ بھی بہت ہی بھلے اور بے نظیر انسان تھے، اللہ ان کی مغفرت کرے اور بلندیٔ درجات سے نوازے، بلکہ ہر فردِ بشر جس سے میں نے ایک لفظ بھی سیکھا اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اسے جزائے خیر دیں اور اجرِ عظیم سے نوازیں۔

یہ سنہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے، مفتی صاحبؒ بحیثیت استاذ دار العلوم میں نو وارد تھے اور میں بحیثیت طالب علم، اس طرح یہ خوش بختی نصیب ہوئی، مگر میں نے شعور کے ساتھ اور نہایت قریب سے انھیں اُس وقت دیکھا جب مخدوم ومحترم حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ بانی دار العلوم الاسلامیہ بستی انھیں اپنے بڑے صاحبزادے برادر عزیز مولانا محمد اسعد قاسمی ناظم دار العلوم الاسلامیہ بستی کے ہمراہ سعودی عرب لائے، ریاض میں حضرت مولانا کا قیام ہمارے مکان پر ہی رہتا تھا، اس سفر کا ایک اہم اور بڑا مقصد دار العلوم الاسلامیہ بستی کے لیے دینی اور عربی کتب کی خریداری تھا کیونکہ ریاض اس کا بہت بڑا مارکیٹ تھا اور کتابیں جتنی وافر مقدار میں دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ

وہاں دستیاب ہوتی ہیں ہندوستان میں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔حضرت مولاناؒ کی فکرمندی اور مفتی صاحبؒ کی رہنمائی میں اُس وقت یہ بہت بڑا کام ہوگیا جو ادارہ کے لیے ناگزیر تھا کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ خریدا گیا زیادہ تر کتب اصول وماٰخذ کی حیثیت رکھتی ہیں،مکتبات کی سیر اور خریداریٔ کتب کے وقت ٹیم کے ہمراہ میں بھی رہتا تھا،اس طرح مفتی صاحب کو نہایت قریب سے دیکھنے اور برتنے کا موقع ملا وہ نہایت بااخلاق،احباب نواز اور زندہ دل انسان تھے یہ ممکن نہ تھا کہ مفتی صاحب کی ہمراہی میں افسردگی،پژمردگی یا بے کیفی اور بے دلی کی کوئی ہلکی پرچھائیں محفل پر پڑ سکے۔

ان کی پُراعتماد شخصیت اور بے ساختہ طبیعت کا ایک مظہر یہ تھا کہ ان میں اعتراف کا بہت حوصلہ تھا وہ بہت کھلے دل سے دوسروں کے کارناموں کا اعتراف کرتے اور نیازمندوں تک کی دلجوئیوں اور حوصلہ افزائیوں سے نہ چوکتے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق وباطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

بانی دارالعلوم الاسلامیہ حضرت مولاناؒ نے مجھ سے ذکر کیا کہ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ کارِ اہتمام وانتظام بنسبت تعلیم وتدریس کے زیادہ باعثِ اجر وثواب ہے چونکہ انتظام وانصرام کے طفیل بہت سارے افراد مصروفِ تعلیم وتعلم ہوتے ہیں اور پوری ایک جماعت کو تشکیل دیتے ہیں جب کہ ان میں کا ایک ایک فرد محض ایک اکائی ہوتا ہے۔

ایک بار کی بات ہے میں دارالعلوم الاسلامیہ میں بغرض ملاقات گیا ہوا تھا،اسی روز شام میں ہمارے علاقہ کے کسی مدرسہ میں مفتی صاحبؒ کی تقریر تھی،ان حضرات نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا مفتی صاحبؒ نے بیان شروع کیا اور بالکل خلافِ توقع میری ریاض کی معمولی سی خدمت وضیافت کو اپنے بیان کی تمہید بنا ڈالا اور مجھے بے حد ندامت کا احساس ہو رہا تھا،کافی طویل توصیف وتذکرہ کرتے رہے اور مجھے یہ اندیشہ ہو رہا تھا ؎

یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور انہیں اس حسنِ ظن کا حسین اور عظیم اجر دے ؎

جمال ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اسی طرح ایک دفعہ میں اپنے گھر موجود تھا اچانک دیکھا کہ مفتی صاحبؒ پوری جماعت کے ساتھ گھر تشریف لے آئے یہ ہمارے اساتذہ اور اکابر کی خردنوازی اور طریقِ تربیت تھا۔حدیث شریف میں ایک دعا وارد ہے۔

"اللهم اجعلني في عيني صغيرا وفي أعين الناس كبيرا"

ترجمہ:اے اللہ مجھے میری نگاہ میں چھوٹا اور لوگوں کی نظر میں بڑا کردے۔

وہ نہایت صاف گوئی اور صراحت سے سراہتے اور ہمت افزائی کرتے ،ابھی حال ہی میں حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ کے بڑے صاحبزادے برادرم مولانا محمد اسعد صاحب بھی بر سبیلِ تذکرہ یہی بات کہہ رہے تھے۔

آخر عمر میں انھیں بھی بہت جسمانی عوارض اور بیماریاں لاحق ہوگئی تھیں جو عام طور پر ہوتا آیا ہے، خدائے رحمٰن ورحیم سے یہ دعا اور توقع ہے کہ وہ ان آزمائشوں کو ان کی لغزشوں کے لیے کفارہ اور رفعِ درجات کا سبب بنادے بلکہ سیئات کو حسنات سے تبدیل کردے وہ مالک الکُل ہے جو چاہے کرسکتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کرسکتا۔

اُن کے تلامذہ اور مستفیدین سے بھی گزارش ہے کہ وہ مفتی صاحبؒ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں جو ہمارے دین کا بھی لازمی حصہ ہے۔

﴿ربنا اغفر لنا ولإخواننا الذين سبقونا بالإيمان ولا تجعل في قلوبنا غلا للذين آمنوا ربنا إنك غفور رحيم﴾

توفیقِ الٰہی کا دارومدار

جس نے یہ کہا ہے کہ ’’توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے‘‘ اُس نے حقیقت کی ترجمانی کی ہے، اللہ تعالیٰ کا دستور ازل سے یہی رہا ہے کہ ہمتِ صالحہ اور ارادۂ صحیحہ ہی پر توفیقِ الٰہی کا دارومدار ہے، بندہ پہلے اپنا ارادہ صحیح کرلے اس کے بعد توفیقِ الٰہی اس کے شاملِ حال ہوگی‘‘۔

(حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتا پوریؒ)

یادِ یارِ مہرباں

مولانا عبدالعلی فاروقی
ناظم دارالعلوم فاروقیہ ومدیر اعلیٰ ماہنامہ ''البدر'' کاکوری لکھنؤ
Email:aafarooqi4@yahoo.com

دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے ترجمان مجلّہ ''فکر اسلامی'' کے مدیر مولانا محمد اسعد قاسمی صاحب زید مجدہم کی طرف سے اپنے مجلّہ کے خصوصی شمارے کے لئے مولانا مفتی شکیل احمد صاحبؒ پر مضمون کا مطالبہ کیا گیا تو اپنے یارِ مہرباں مفتی شکیل کے دور طالب علمی سے دمِ واپسیں تک یادوں کے دریچے کھلتے چلے گئے، اور ایک مرتبہ پھر مفتی شکیل کی جدائی نے بے چین کردیا۔

یہ نصف صدی سے بھی قبل تعلیمی سال ۸۸-۱۳۸۷ھ کی بات ہے جب میں اور مفتی شکیل مرحوم دونوں مادر علمی ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے طالب علم ہوا کرتے تھے، اور دو تعلیمی سالوں میں ہم دونوں نے کئی کتابیں ایک ساتھ پڑھی تھیں، اگرچہ ان کا شمار جماعت کے ممتاز وفائق الاستعداد طلبہ میں ہوتا تھا اور میں بس اسباق میں شرکت کرنے والا ایک ''یوں ہی سا'' طالب علم تھا۔ اگرچہ علمی استعداد نہ سہی، خاندانی نسبتوں ہی کی وجہ سے سہی، میرا شمار بھی کسی نہ کسی درجہ میں جماعت کے ممتاز طلبہ ہی میں ہوتا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان ایک مشترک چیز ''کم آمیزی'' تھی۔ اپنے بڑوں کی تاکید اور دیوبند کے مقامی نگرانوں کی کڑی نظر کی وجہ سے میرا حلقۂ یاراں بھی بہت ہی محدود، بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا اور یہی حال شکیل سیتاپوری کا بھی تھا کہ وہ بس جمیل سہارنپوری کے علاوہ کسی دوسرے طالب علم کے ساتھ بہت کم نظر آتے تھے۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ہم دونوں کا ایک دوسرے سے گھلنے ملنے کا بہت جی چاہتا تھا، مگر ملنا بس کبھی کبھار چلتے پھرتے یا پھر دوران سبق ہی

ہو پاتا تھا۔ بس ایسی ہی سرسری اور تشنہ ملاقاتوں کے ساتھ ہم دونوں دارالعلوم دیوبند سے اپنا اپنا تعلیمی سفر پورا کرنے کے بعد شعبان ۱۳۹۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۰ء میں اپنی اپنی منزل کی طرف کوچ کر گئے۔ میں تو لکھنؤ اپنے گھر واپس آیا، اور پھر کم وبیش ڈیڑھ ماہ بعد ۵؍دسمبر ۱۹۷۰ء سے والد ماجد حضرت مولانا محمد عبدالحلیم صاحبؒ نے اپنے قائم فرمودہ نوخیز مدرسہ دارالعلوم فاروقیہ سے تدریسی و انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ مجھے وابستہ کر دیا۔ جہاں سے تادم تحریر میرا علمی وروحانی رشتہ قائم ہے، اور میری جیسی تیسی تمام حصولیابیاں اسی ادارہ کی مرہون منت ہیں۔ اور جس کا شمار اس وقت ملک کے ممتاز وبافیض دینی مدارس میں ہوتا ہے۔ وذالك فضل الله يؤ تيه من يشاء۔

مفتی شکیل صاحب دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ حاصل کرنے کے بعد کہاں کہاں اور کن کن اداروں سے وابستہ رہے، اس کی مکمل تفصیلات میرے علم میں نہیں ہیں، لیکن یہ علم ہے کہ کم وبیش دس برس تک وہ اپنی مادر علمی ام المدارس دارالعلوم دیوبند سے ایک بہت ہی لائق ومقبول استاذ کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ اور اس کے بعد وہ دارالعلوم حیدرآباد اور دارالعلوم الاسلامیہ بستی سے بھی بحیثیت شیخ الحدیث وابستہ رہے۔ وہ جہاں رہے اپنی علمی وجاہت، فیض رسانی اور خوش کلامی وخوش اخلاقی کی وجہ سے امتیازی آن بان اور شان کے ساتھ رہے۔ وہ ایک جید الاستعداد عالم اور ہر دل عزیز استاذ ہونے کے ساتھ ہی ملک کی صف اول کے خطیبوں میں سے ایک تھے۔ موضوع چاہے خالص علمی ومناظرانہ ہو یا عوامی اصلاح کا، بات سیرت النبیؐ وسیرت صحابہؓ کی کر رہے ہوں یا اپنے لائق صد افتخار اسلاف کے کارناموں کو بیان کر رہے ہوں، مسلمانوں کی علمی ومعاشی پس ماندگی اور ان کی فلاح کا ذکر کر رہے ہوں یا ملکی وعالمی سیاست اور سیاسی استحصال پر کلام کر رہے ہوں، ان کا علمی تبحر، وسعت نظر اور انداز تحلیل وتجزیہ عوام سے لے کر خواص تک سب کو اپنا اسیر کر لیتا تھا۔ خالص لکھنوی زبان وبیان اور پرجوش انداز خطابت میں دوران تقریر وخطاب اردو، عربی اور فارسی کے برمحل اشعار کی آمیزش ان کی تقریروں کو اتنا مؤثر اور طاقتور بنا دیتی تھی کہ سامعین پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ کسی بڑے سے بڑے جلسہ میں مفتی شکیل صاحبؒ کی شرکت جلسہ کی کامیابی کی ضمانت ہوتی تھی۔

انہوں نے اپنی زندگی کے آخری چند برس یکسو ہو کر لکھنؤ میں گذارے۔ جہاں ان کا ذاتی

مکان تھا۔ لکھنؤ کو اپنا وطن ثانی بنانے کے بعد بھی اگر چہ دار العلوم الاسلامیہ بستی اور اپنے وطن تمبور کے مدرسہ سے ان کی رسمی وابستگی رہی، لیکن میں اسے ان کے ''دور فراغ'' سے تعبیر کرتا ہوں ——اور دور فراغ میں ہمیں اپنی تشنگی دور کرنے کے بھی خوب خوب مواقع ملے —— ان کے ساتھ متعدد جلسوں میں شرکت کرنے کے مواقع بھی ملے اور کھل کر بات کرنے کے لئے خلوتیں بھی ملیں۔ ان سے موبائل کے ذریعہ بھی ملاقاتیں ہوجاتیں اور کبھی موقع ملنے پر وہ میرے گھر آجاتے اور کافی کافی دیر تک ہم مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھیؒ کے فرزند جناب قاری مشتاق احمد صاحب مرحوم بہت یار باش اور مجلسی آدمی تھے۔ ایک لمبے عرصے تک ان کے مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں قریب قریب روز ہی بعد نماز مغرب بہت سے لائق ذکر احباب جمع ہوتے تھے۔ جن میں مفتی شکیل صاحبؒ کے علاوہ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، میرے پھوپھا مولانا محمد رفیق القاسمی، مرحوم صفی انعام اللہ صاحب، سید ضیاء الحسن صاحب مرحوم، رئیس انصاری صاحب، اور دوسرے کئی حضرات روز کے حاضر باش لوگوں میں ہوتے تھے۔ ہفتہ میں دو ایک بار قاری صاحب و دیگر احباب کے اصرار پر میری حاضری بھی ہوجاتی تھی۔ یہ مجلس احباب بڑی دلچسپ ہوتی تھی اور اس میں ہر قسم کے موضوعات پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ کبھی شعر وشاعری کی بات آجاتی تو مفتی شکیل صاحبؒ کے بھی شاعرانہ جوہر خوب خوب کھلتے اور ہم سب لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے۔

مفتی صاحب کی وفات سے چند برس پہلے ان کی رفیقۂ حیات کی وفات ہوگئی تھی۔ عمر کے اس پڑاؤ پر رفیقۂ حیات کا ساتھ چھوٹنے سے جو زحمتیں و پریشانیاں ہوتی ہیں، ان کا مفتی صاحب کو بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس دوران ان کی علالت کی وجہ سے معذوریاں بھی بڑھتی گئیں۔ صحت کی کمزوری اور مستقل علالت کی وجہ سے شہر اور شہر کے باہر جانے آنے کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا تھا۔ میری ملاقات بھی بس گاہے بہ گاہے موبائل ہی تک محدود ہوگئی تھیں۔ ان احوال نے انہیں ڈپریشن کا مریض بھی بنادیا تھا۔

اسی دور کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا —— مفتی صاحبؒ ہی کے ضلع سیتاپور کے مقام گڈیہ حسن پور کے ان کے ایک ہم نام شکیل احمد تھے جو میرے شاگرد، میرے مرحوم بھائی عبد الولی فاروقی

کے ہم سبق ساتھی اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ وہ اپنے ضلع ہی کے ایک مدرسہ میں صدر مدرس تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، جس کا ان کو بہت احساس تھا۔ غالباً اسی اثر سے وہ دماغی مریض ہوگئے اور بسا اوقات ان پر ایسی جنونی کیفیت طاری ہوجاتی کہ وہ کسی کو پہنچان بھی نہیں پاتے تھے۔ کچھ عرصہ کی علالت کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ چوں کہ وہ بھی ایک عالم اور ایک مدرسہ کے صدر مدرس تھے اس لئے سوشل میڈیا کے اس دور میں ان کے انتقال کی خبر بھی گردش کرنے لگی۔ نام کی یکسانیت کی وجہ سے بہت سے لوگ مولانا شکیل کو مفتی شکیل سمجھ کر مفتی صاحب کی خیریت دریافت کرنے لگے۔

پہلے مفتی صاحب ہی کے حوالہ سے یہ خبر مجھ تک بھی پہنچی، جس کی تصدیق کے لئے میں نے مفتی صاحبؒ کے ماموں زاد بھائی قاری محمد صدیق صاحب کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ کئی لوگ اور بھی دریافت کر چکے ہیں۔ مفتی صاحب بیمار تو ہیں مگر بحمد اللہ باحیات ہیں۔ ان ہی کے مشورہ پر میں نے مفتی صاحب کو خیریت دریافت کرنے کے لئے فون کیا تو وہ بپھر پڑے اور مجھ سے بہت جھنجھلائے ہوئے لہجہ میں کہا ”ہاں بھائی زندہ ہوں، نہ جانے کون شکیل ہے جس نے مجھے جیتے جی مار دیا“۔ بعد میں جب مجھے ان شکیل کی وفات کی اطلاع ملی جن سے میرا رشتہ بھی تھا اور اگر بروقت مجھے اطلاع ملتی تو میں ان کی نماز جنازہ و تدفین میں شرکت کیلئے ضرور جاتا۔ بہ ہر حال اس تصدیق کے بعد میں نے دوبارہ مفتی شکیل صاحبؒ کو فون کر کے تفصیل بتائی تو انہیں علم ہوا کہ یہ کون ان کے ہم نام مولانا شکیل تھے۔

مفتی شکیل صاحبؒ کی قابل رشک و لائق تقلید زندگی پر متعدد اہل قلم خصوصاً ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان کے ہزاروں شاگرد روشنی ڈالیں گے، مگر میں ان کی زندگی کے ایک ایسے کمزور پہلو کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس کا ذکر خود ان سے متعدد بار میں نے کیا اور بالآخر انہوں نے اس کو تسلیم بھی کیا۔

وہ یہ کہ مفتی صاحب کے ماشاء اللہ چار بیٹے ہیں، مگر ان میں سے کسی کو انہوں نے اپنی لائن میں لگا کر عالم دین اور حافظ قرآن نہیں بنایا، حالانکہ مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اسی علم دین کی برکت سے جو مقام عطا کیا وہ جگ ظاہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری معلومات کی حد تک مفتی شکیل

صاحب اپنے گھر گھرانے کے پہلے عالم دین تھے، اور اللہ تعالیٰ نے اس علم کی برکت سے انہیں یہ مقام عطا کیا کہ وہ اپنے خاندان کے اسلاف واخلاف سب کے تعارف کا ذریعہ بنے —— پھر بھی نہ جانے کیوں مفتی صاحب نے اپنے بیٹوں میں سے کسی کو اپنی لائن میں نہیں ڈالا کہ ان کی نماز جنازہ ان کا کوئی بیٹا پڑھاتا اور ان کے نام کو وہ روشن کرتا، اگرچہ میرے علم کے مطابق ماشاء اللہ مفتی صاحب کے سب بیٹے بہت لائق ہیں۔ اور وہ اپنے ایک انجینئر بیٹے کے پاس اس کی جائے ملازمت کلکتہ میں ڈیڑھ سال رہ کر اپنی وفات سے چندروز پہلے ہی لکھنؤ واپس آئے تھے۔ مگر میرا احساس یہ ہے کہ اگر ان کا کوئی بیٹا عالم ہوتا تو ان کا نام دور تک اور دیر تک زندہ رہتا۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے ''یادِ یارِ مہرباں'' مفتی شکیل احمد صاحبؒ کو کروٹ کروٹ چین عطا فرمائے۔ ان کی سیئات سے درگذر فرما کر ان کی حسنات کو اپنی شان رحمت کے مطابق قبول فرمائے اور انہیں اعلیٰ علیین میں مقام مرحمت فرمائے۔ (آمین)

❁❁❁

زندگی کا نچوڑ

بعض فلاسفہ نے کہا ہے: ''میری زندگی کا نچوڑ چند سطروں میں یہ ہے کہ آپ کی تونگری آپ کے دل میں ہے یعنی خارج سے تونگر بننے کی کوشش عبث ہے اگر داخل میں تونگری نہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا عمل آپ کی قیمت ہے، یعنی اگر آپ نے اپنا پسندیدہ عمل انجام دے دیا تو آپ نے اپنی قیمت وصول کر لی، اب بے فکر ہو جایئے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اپنے جذبۂ دل کو دیکھئے نتیجہ کو نہ دیکھئے یعنی جذبہ پاکیزہ ہونا چاہئے، نتیجہ خواہ مختصر ہو۔

چوتھی بات یہ ہے کہ لوگوں سے زیادہ توقع نہ رکھئے، یعنی ہر وقت اِس انتظار میں نہ رہئے کہ لوگ آپ کو سراہیں گے، یا لوگ آپ کی محنت کے ساتھ انصاف کریں گے۔

(حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ)

حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ
اور
مظاہر علوم وقف سہارنپور

مولانا محمد سعیدی
ناظم ومتولی مظاہر علوم وقف سہارنپور

حضرت مولانا مفتی شکیل احمد قاسمی سیتاپوریؒ اپنے عہد کے نامور مقررین میں سے تھے، آپ کو بچپن ہی سے تقریر وخطابت کا ذوق وشوق تھا، جوں جوں تعلیمی درجات بڑھتے گئے، تقریری صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوتا گیا یہاں تک کہ آپ اپنے زمانۂ طالب علمی میں ہی دیوبند اوراس کے قرب وجوار میں بلائے جانے لگے اور فراغت کے بعد تو پورے مغربی یوپی میں آپ بلبل کے مانند قریہ قریہ چہکنے لگے، اس زمانے کے لوگ جن کا آپ سے تعلق ہوا یا آپ کا جن لوگوں سے تعلق ہوا وہ اخیر تک آپ سے تعلق رکھتے رہے اور مفتی صاحب موصوفؒ نے بھی ہجومِ کار اور پیہم اسفار کے باوجود ان سے ربط وتعلق برقرار رکھا۔

مفتی صاحبؒ کے والد ماجد کا نام محمد اسماعیلؒ تھا، آپ اگر چہ وطناً تمبور ضلع سیتاپور کے رہنے والے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ ہزاروں لوگوں کے دلوں میں رہنے بسنے والے تھے، آپ کی شہرت اور مقبولیت پورے بھارت میں تھی، ہر جگہ آپ کے چاہنے اور جاننے والے موجود تھے۔

آپ نے ۱۵؍شوال المکرم ۱۳۸۳ھ مطابق ۹؍فروری ۱۹۶۴ء میں یہاں مظاہر علوم میں داخلہ کے لئے درخواست داخل کی، مدرسہ کی طرف سے آپ کا داخلہ امتحان لینے کے لئے حضرت

مولانا جمیل الرحمٰن امروہویؒ کا نام تجویز ہوا۔ مفتی صاحبؒ نے ہدایۃ النحو، مرقات، فصول اکبری، علم الصیغہ اور نور الایضاح کا امتحان دیا اور اچھے نمبرات سے کامیاب ہوئے۔

داخلہ کے بعد آپ نے کافیہ، تہذیب، مختصر القدوری، مراح الارواح، شرح تہذیب، مفید الطالبین، نفحۃ الیمن اور بحث فعل کے علاوہ تجوید اور املاء میں اچھی خاصی محنت کی چنانچہ رجسٹر داخلہ کے مطابق مفتی صاحبؒ اپنی جماعت میں سب سے امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے اور انعام میں کئی کتب حاصل کیں۔

مدرسہ مظاہر علوم میں تعلیم کے دور کا تذکرہ آپ کرتے رہتے تھے چنانچہ بعض مرتبہ یہ بھی ذکر کیا کہ میرے تمام اساتذہ میں مجھے سب سے زیادہ علمی فائدہ حضرت مولانا اطہر حسینؒ سے ہوا، چونکہ مفتی صاحب کا داخلہ یہاں ابتدائی عربی میں ہوا تھا، اس عمر میں اتنا شعور بھی پختہ نہیں ہوتا ہے اور آپ نے ایک ہی سال مدرسہ کی شاخ (جو حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہانپوری کی طرف منسوب کرتے ہوئے خلیلیہ شاخ سے موسوم ہے) گزارا تھا اس لئے آپ کی زبان سے بڑے اساتذہ مثلاً فقیہ الاسلام حضرت مفتی مظفر حسینؒ، ریحانۃ الہند حضرت مولانا شیخ محمد یونسؒ وغیرہ کا تذکرہ کم ہی سننے میں آیا۔

والد محترم حضرت مولانا اطہر حسینؒ کے انتقال کے بعد ماہنامہ آئینۂ مظاہر علوم کا خصوصی شمارہ ''شیخ الادب نمبر'' شائع کرنے کی تجویز ہوئی تو دیگر صاحبان علم وقلم کیساتھ حضرت مفتی صاحبؒ سے بھی مضمون کی فرمائش کی گئی، مفتی صاحبؒ نے بے انتہا مصروفیات اور مسلسل اسفار کے باوجود اپنے استاذ محترم کی محبت میں مضمون لکھنے کا وعدہ بھی کیا اور وعدہ پورا بھی کیا، یہ مضمون پانچ صفحات پر مشتمل ''حوروں کو شکایت ہے کہ کم آمیز ہے مؤمن'' کے عنوان سے رسالہ مذکور میں شائع ہوا۔

مذکورہ مضمون میں آپ نے مظاہر علوم میں اپنے زمانۂ طالب علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے کئی اہم باتیں تحریر کیں جن میں سے بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو آپ کی ذہانت وفطانت، ذوق عربیت اور پختگیٔ استعداد پر دلالت کرتی ہیں، چنانچہ حضرت والد صاحبؒ کی عربی اور عربیت پر گفتگو کرتے ہوئے اصمعی کا ایک واقعہ لکھا جس میں عربی کے آٹھ دس اشعار مع ترجمہ لکھے اور پھر لکھا کہ

''یہ اشعار ہم نے اپنے حافظہ سے لکھے ہیں اور حضرت مولانا ہی سے سن کر ہم کو حفظ ہوگئے

تھے‘‘

قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ خود مفتی صاحبؒ کی ذہانت اور فطانت کس درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ کم سنی و کم عمری میں اپنے استاذ گرامی سے سن سن کر آپ نے نہ صرف اشعار یاد کر لئے بلکہ مکمل ترجمانی اور واقعہ کی مکمل تفصیل بھی من وعن بیان کر دی۔

مفتی صاحبؒ گو مضمون نویسی نہیں کرتے تھے بلکہ بہت کم کرتے تھے لیکن ان کے مضمون میں عمدہ تعبیرات کا ایک جہان اور بہترین اسلوب نگارش کا ایک آسمان نظر آتا ہے چنانچہ اسی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’ہمارے آباء واجداد اگر چہ عظیم تھے لیکن ہم وہ نہیں ہیں کہ صرف آباء واجداد پر فخر کرتے رہیں اور ’’پدرم سلطان بود‘‘ کہہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، ہم بھی ویسی ہی عمارت بنائیں گے جیسی ہمارے آباء واجداد نے بنائی ہے اور ہم بھی وہی کام اور کارنامے انجام دیں گے جو ہمارے آباء واجداد نے انجام دئے ہیں‘‘۔

حضرت مولانا مفتی مظفر حسینؒ کا تذکرہ اگر چہ چند سطور میں کیا ہے لیکن فصاحت وبلاغت اور ادبیت سمیٹ دی ہے:

’’وہ جید حافظ اور نہایت عمدہ قاری تھے، ان کی بھولی بھالی صورت اور ان کی مینا جیسی آواز نے ان کی شخصیت کو مقناطیسی بنا دیا تھا، ان کو یہ شرف حاصل تھا کہ حضرت شیخ الحدیثؒ نے ہمیشہ ان کی اقتدا میں جمعہ ادا کیا، ان کا مزاج ریشم اور مخمل کی طرح نرم اور ان کا دل بچوں کی طرح معصوم تھا، کدورت اور کینہ کیا ہوتا ہے شاید وہ اس سے واقف بھی نہیں تھے‘‘۔

مفتی صاحبؒ مظاہر علوم (وقف) سے اس لئے بھی خاص تعلق رکھتے تھے کہ ان کا مزاج وقف علی اللہ کی تائید وحمایت کا تھا، وہ دیوبند میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی اُس جماعت کے رکن اور کارکن تھے جو وقف علی اللہ کو دین کا شعار اور تحفظِ وقف کو اسلام کی ضرورت اور فرض تصور کرتا تھا۔

ایک مرتبہ ختم بخاری شریف کے موقع پر انھیں دعوت دی گئی، آپ نے حسب مزاج بڑی خوبصورت اور مرصع تقریر کی اور خاص پس منظر میں ایک شعر بڑے وجد اور اعتماد کے ساتھ پڑھا:

بنونا بنو أبنائنا، و بناتنا
بنوهنّ أبناء الرجال الأباعد

ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہمارے بیٹے ہیں اور ہماری لڑکیوں کے بیٹے، اجنبی مردوں کے بیٹے ہیں۔

مفتی صاحبؒ کو شعروشاعری سے بھی دلچسپی تھی لیکن کبھی اسٹیج پر ترنم کے ساتھ شاید ہی کسی نے پڑھتے سنا ہو، آپ اشعار کہتے بھی تھے لیکن بہت ہی کم، البتہ دوسرے عربی، فارسی اور اردو شعراء کے اس قدر اشعار زبانی یاد تھے کہ ممکن ہے کہ انکی تعداد کئی ہزار تک پہنچ جائے۔

کبھی کبھی بہت ہی پُر لطف واقعات خصوصی مجلس میں سناتے اور خوب ہنستے اور ہنساتے، چنانچہ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مفتی صاحب نئے نئے دارالعلوم دیوبند میں استاذ بنائے گئے تھے اور ہر چہار سمت آپ کی تقریروں کی دھوم تھی، فرمایا کہ ایک دفعہ چرتھاول ضلع مظفرنگر میں جلسہ تھا، میں بھی مدعو تھا اور دارالعلوم دیوبند کے ایک بڑے مبلغ بھی تشریف رکھتے تھے، پہلے میری تقریر کرائی گئی، میں نے ایک گھنٹہ تقریر کی اور آکر مبلغ صاحب کی چارپائی پر پائنتی کی جانب بیٹھ گیا، حضرت نے مجھ سے بڑے پیار سے فرمایا کہ

''پیارے تم نے بڑی اچھی اور عمدہ تقریر کی ہے، تم نے کھانا کھالیا؟ میں نے عرض کیا جی حضرت کھالیا، پھر پوچھا کیا کھلایا ہے اِن لوگوں نے؟ میں نے عرض کیا کہ بریانی تھی، فرمایا ہاں بریانی تھی اور وہ بھی بڑے کی، پیارے ایسی بریانی کھا کر اتنی علمی اور مدلل تقریر کروگے تو دماغ پلپلا ہوجائے گا، جیسی روح ویسے فرشتے، جیسی غذا ویسی تقریر''۔

مفتی صاحبؒ کی گفتگو چاہے منبر ومحراب کی ہو یا اسٹیج اور ڈائس کی، مجلس کی ہو یا درس وتقریر کی تقریباً یکساں ہوتی تھی، بہت ہی مرتب بولتے تھے، نہ اٹکنا، نہ الجھنا، نہ شرمانا، نہ کسی سے متاثر ہونا، سچ بولنا اور سچ کی حمایت میں پیش پیش رہنا یہی سب خوبیاں تھیں جواُن کی شناخت اور پہچان بن چکی تھیں۔ چنانچہ

مجھے یاد نہیں ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے آنے کے بعد کبھی دارالعلوم دیوبند میں قدم رکھا ہو۔
مجھے یاد نہیں ہے کہ کبھی وقف علی اللہ کے مخالفین سے ازراہِ تعلق ہاتھ ملایا یا اپنے پاس بلایا ہو۔

مجھے یاد نہیں کہ اللہ والوں سے عداوت اور بغض رکھنے والوں سے کبھی دوستی یا یارانہ گانٹھا ہو۔
مجھے یاد نہیں کہ آپ نے کبھی زہر ہلاہل کو قند کہا ہو۔
مجھے یاد نہیں کہ کبھی آپ نے مصلحتوں کے آگے ہتھیار ڈالے ہوں۔
مجھے یاد نہیں کہ کبھی آپ نے دین کے غداروں اور نفاق کے ٹھیکیداروں سے تعلق بنایا ہو۔

وہ اللہ کے لئے دوستی اور اللہ کے لئے دشمنی کے قائل تھے، جو راہ حق پر چلا، آپ اس کے پیروں میں پھول اور کلی بن کر بچھ گئے اور جو جادۂ اعتدال سے برگشتہ ہوا، آپ اس کے لئے سدِّ راہ بن گئے۔ یہی ہر مؤمن کا خاصہ، ہر مسلم کا امتیاز اور ہر کلمہ گو کا وطیرہ ہونا اور رہنا چاہئے۔ اللہ ان پر رحم فرمائے۔ (آمین)

یــاغـــائبـــا فـــی الثـریٰ یتلـی مـحـاسـنـهٗ
الــلّٰــــهُ یـــولیک غـــفـــرانـــاً وإحـســـانـــا
إن کـنــت جُـرِّعـتَ کـأس الـموت واحدة
فـــفـــی کـل یـوم أذوق الـمـوت ألـوانـا

۞۞۞

عرب کا ایک مقولہ

عرب کا مقولہ ہے: "مَنْ خَدَعَ مَنْ لَا یَخْدَعُ فَإِنَّمَا یَخْدَعُ نَفْسَهٗ" "جس کو فریب نہیں دیا جاسکتا اُس کو فریب دینا دراصل خود کو فریب دینا ہے"۔ یہ مقولہ بہت صحیح ہے اس لئے کہ فریب تو اُس کو دیا جاسکتا ہے جو کسی معاملہ کے اندرون سے ناواقف ہے اور جو اندرون سے بخوبی واقف ہے اُس کو فریب دینا اپنے آپ کو فریب دینا ہے ؎

جلوے مری نگاہ میں کون ومکاں کے ہیں
مجھ سے وہ چھپ سکیں بھلا ایسے کہاں کے ہیں

(حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ)

میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

از: مولانا محمد سالم قاسمی بانی ومہتمم جامعہ قاسمیہ دارالعلوم زکریا ٹرانسپورٹ نگر، مرادآباد

جب سے یہ گلشن وجود میں آیا ہے، آمد ورفت اور ہست ونیست کا سلسلہ جاری ہے اور نہ معلوم ابھی کتنے اشخاص آئیں گے اور اپنی اپنی حیاتِ مستعار کو پورا کر کے اِس عالمِ آب وگِل کو ''الوداع'' کہہ کر رخصت ہوجائیں گے، تاہم کچھ ہستیاں اور شخصیات اتنی عظیم ہوتی ہیں کہ خود جانے کو چلی جاتی ہیں لیکن چمن میں، ذہن ودماغ میں اور فکر وخیالات میں ان کے کمالات وخدمات اور نقوش وتأثرات باقی رہتے ہیں، اُنہیں خوش نصیب افراد میں ایک نام: بے پایاں خوبیوں کے حامل اور اَن گنت صلاحیتوں کے مالک استاذِ گرامی قدر حضرت مولانا مفتی شکیل احمد صاحب قاسمی سیتاپوریؒ کا بھی ہے، جو خود دارِ فنا سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے، مگر اپنے پیچھے بے شمار جیدالاستعداد تلامذہ اور گرانقدر تالیفات وتصنیفات کی شکل میں کچھ ایسے تابندہ وپایندہ نقوش چھوڑ گئے جنہیں اہلِ مدارس واہلِ علم طویل عرصے تک فراموش نہیں کرسکیں گے ؎

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

آپ کی پیدائش سرکاری کاغذات اور تعلیمی اسناد میں اندراج کے مطابق ۱۹۴۸ء میں قصبہ ''تمبور''، ضلع سیتاپور میں ہوئی، ابتدائی تعلیم مقامی تعلیم گاہ ''مدرسہ ضیاء العلوم'' میں حاصل کی، پھر ''مدرسہ نور العلوم بہرائچ'' میں داخل ہوکر مختلف اساتذۂ کرام سے استفادہ کیا، بعدہٗ تعلیمی سال ۶۴-۱۹۶۳ء میں ''مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور'' میں داخلہ لیا اور وہاں کے شیوخ سے کسبِ فیض کیا، پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ۶۵-۱۹۶۴ء میں ام المدارس ''دارالعلوم دیوبند'' کا رخ کیا، وہاں کے علمی ماحول اور معیاری اساتذہ سے بھرپور فیض حاصل کیا، اور دوران تعلیم اپنی محنت وجانفشانی،

شرافت وانکساری، تواضع وعاجزی اور اعلیٰ صلاحیت وصالحیت کی بنیاد پر اساتذہ و منتظمین کے منظورِ نظر بن گئے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (م:۱۹۸۳ء) اور حضرت مولانا فخر الحسن صاحبؒ (م:۱۴۰۰ھ) سے خاص تعلق رہا، ۱۹۶۹ء میں تکمیلِ تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند کی دورس انتظامیہ نے اِس قیمتی ہیرے کو تدریس کے لئے منتخب کرنا چاہا، لیکن مجلسِ شوریٰ کے ایک مؤقر رکن نے یہ کہہ دیا کہ ابھی داڑھی نہیں ہے، نتیجۃً سردست یہ انتخاب ملتوی ہوگیا، چنانچہ اکابرین کے مشورہ سے ''مدرسہ محمودیہ سروٹ مظفرنگر'' میں تدریس کا آغاز کیا، پھر غالباً ۷۲-۱۹۷۱ء میں بحیثیت مدرس دارالعلوم دیوبند مدعو کیا گیا اور دورانِ انٹرویو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ (م:۱۹۹۷ء) نے حاضر جوابی اور پختہ صلاحیت واستعداد کو دیکھتے ہوئے مزاحاً فرمایا کہ: مولانا صاحب "لا أدری" بھی ایک جواب ہوتا ہے، بہرحال حضرت والا دارالعلوم دیوبند کے استاذ منتخب ہوئے اور آپ نے اپنی خداداد لیاقت وصلاحیت، کمالِ علم وفن اور افہام وتفہیم کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باعث، بہت جلد غیر منقسم دارالعلوم دیوبند میں شہرت پائی، آپ کا درسِ تفسیر بے پناہ مقبول ہوا، بحمد اللہ احقر کو بھی حضرت والا سے جلالین شریف اول، مقاماتِ حریری اور البلاغۃ الواضحہ جیسی اہم اور فنی کتب پڑھنے کی سعادت میسر آئی، احقر نے دورانِ تعلیم حضرت سے بہت سے ایسے علمی اور فنی نکات سیکھے، جو آج تک ذہن ودماغ میں محفوظ ہیں، ''مقاماتِ حریری'' کی کاپی حضرت والا نے ناچیز کو عنایت فرمادی تھی، احقر اس سے خوب مستفید ہوتا اور حضرت کی ہدایت پر ساتھیوں کو بھی املاء کرادیتا، دورانِ درس حضرتِ والا ایسے بیش بہا قیمتی موتی لُٹاتے کہ طبیعت فرطِ انبساط سے جھوم جاتی، بروقت ایسے اشعار سناتے کہ طلبہ عش عش کر جاتے، حضرت والا نے دارالعلوم یوبند میں تقریباً دس سال اپنی گُل کاریوں اور رشک ریزیوں سے دارالعلوم دیوبند کی فضا کو معطر کیا کہ ۱۹۸۲ء میں قضیۂ نامرضیہ پیش آیا اور مفتی صاحبؒ دارالعلوم دیوبند سے علیٰحدہ ہوگئے۔

دارالعلوم سے علیٰحدگی کے بعد مختلف مدارس وقف دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم حیدرآباد، مدرسہ ضیاء العلوم قصبہ تمبور، دارالعلوم الاسلامیہ بستی، مدرسہ دارالعلوم زکریا دیوبند وغیرہ میں اپنے فضل

وکمال کا ڈنکا بجایا اور اپنے فیوض وبرکات سے مستفید کیا۔

مؤرخہ: ۱۰؍رجب المرجب ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۹؍مارچ ۲۰۱۸ء بروز جمعرات جامعہ قاسمیہ دارالعلوم زکریا ٹرانسپورٹ نگر مرادآباد میں ''ختم مشکوٰۃ شریف وجلسۂ دستار بندی'' کے عنوان سے منعقد ہونے والے عظیم الشان اجلاس عام میں بحیثیت ''مہمانِ خصوصی'' تشریف لائے، یہاں طلبہ کی تعداد واستعداد، نظم وانتظام اور اعزاز واکرام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، مختلف مجالس میں تذکرہ خیر کیا اور ماہِ شوال ۱۴۳۹ھ میں حضرت والا نے بذاتِ خود جامعہ ہٰذا میں تدریسی خدمات انجام دینے کی خواہش ظاہر کی جو یقیناً ہم اربابِ جامعہ کے لئے لائق فرحت ومسرت تھی اور باعثِ حیرت وتعجب بھی ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیم صبح تیری مہربانی

چنانچہ انتظامیہ نے اِس عظیم پیش کش کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے بخوشی بلکہ احسان مندی وسعادتمندی کے ساتھ قبول کیا اور حضرت والا کی جامعہ میں تشریف آوری سے قبل آناً فاناً مسجد کے پیچھے جانبِ جنوب میں ایک کمرہ تمامتر سہولیات کے ساتھ مختص کیا گیا، جو آج بھی بسا اوقات ''مفتی شکیل صاحب والا کمرہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ناشتے، کھانے اور دیگر ضروریات وخدمات کے لئے باضابطہ ایک خادم کا انتظام کیا گیا، چنانچہ حضرت والا مؤرخہ: ۱۵؍ذیقعدہ ۱۴۳۹ھ مطابق ۲۴؍جولائی ۲۰۱۸ء بروز شنبہ جامعہ میں تشریف لائے، مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف اور مختصر المعانی جیسی اہم کتب کے اسباق آپ سے متعلق ہوئے، شام کا وقت حضرت کے آرام کے لئے فارغ کیا گیا، وقت کے بے پناہ پابند تھے، گھنٹہ لگتے ہی درسگاہ میں تشریف لے جاتے اور مکمل گھنٹہ بڑی عرق ریزی اور پابندی کے ساتھ پڑھاتے، وقتاً فوقتاً اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں قیمتی آراء ومشوروں سے نوازتے رہتے، بالآخر ماہِ ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ مطابق دسمبر ۲۰۱۸ء میں اپنی مختلف بیماریوں اور ذاتی عوارض کی بنیاد پر حضرت والا نے معذرت کا اظہار کیا، جس کو سردست بادلِ نخواستہ قبول کیا گیا اور حضرت والاؒ سے گذارش کی گئی کہ جب بھی آپ کو طبعی سکون ہو، جامعہ آپ کے

استقبال کے لئے پہلے کی طرح ہمہ وقت تیار ہے لیکن حضرت والاؒ اپنی مختلف الانواع بیماریوں سے باہر نہ نکل پائے اور دوبارہ حضرت والاؒ کی تشریف آوری نہ ہوسکی، یوں حضرت والاؒ کی تدریسی زندگی کا اختتام جامعہ قاسمیہ دارالعلوم زکریا ٹرانسپورٹ نگر مرادآباد پر ہوا، جامعہ میں حضرت والا کی نصف سالہ تدریس جامعہ کی تاریخ کے ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ع

آئے تھے ہم مثلِ بلبل سیر گلشن کر چکے

آپ حدیث وتفسیر، فقہ وادب، منطق وفلسفہ میں یدِ طولیٰ، مضمون نگاری کا شوق اور شعر وشاعری کا ذوق رکھتے تھے، حضرت مفتی صاحبؒ کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول ترین واعظ وخطیب بھی تھے، کسی جلسے میں ان کی شرکت اجلاس کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی، نصف صدی سے زائد آپ نے تدریس وخطابت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں اور مختلف پلیٹ فارم کے ذریعے مسلکِ حق کی بیباک ترجمانی کی، آپ نے کئی چھوٹی بڑی کتابیں مثلاً تفسیر بیضاوی کی تقریر ''الحاوی''۔ شرح سلم العلوم ''میزان العلوم''۔ ''دیکھنا تقریر کی لذت ...... جلد اول ودوم'' وغیرہ بھی تحریر فرمائیں، جن سے آپ کی علمی گیرائی وگہرائی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

بالآخر تدریس وخطابت کا یہ آفتاب مؤرخہ ۱۷ ؍محرم الحرام ۱۴۴۶ھ مطابق ۲۴؍جولائی ۲۰۲۴ء بروز چہارشنبہ بوقت ڈھائی بجے شب غروب ہوگیا اور اپنے پیچھے حسین یادوں کا ایک طوفان چھوڑ کر دارِفانی سے دارِجاودانی کی طرف کوچ کرگیا، "إنا لله وإنا إليه راجعون. إن لله ما أخذ وله ما أعطىٰ، وكل شئ عنده بأجل مسمىٰ، فلتصبر، ولتحتسب".

بلاشبہ رنج وغم زندگی کا حصہ ہے، حیات ممات کا پیش خیمہ ہے، لیکن رضا بالقضا ہی ایمان کا تقاضہ اور غمناک موقعوں پر صبر جمیل صابرین کا خاصہ ہے، تاہم احقر اس موقع پر اپنی جانب سے اور تمام خدامِ ''جامعہ قاسمیہ دارالعلوم زکریا مرادآباد'' کی طرف سے حضرت مفتی صاحبؒ کے برادران وپسران، پسماندگان، شاگردان اور دیگر تمام احباب کی خدمت میں اُنہیں الفاظ واشعار کو تعزیۃً پیش کرتا ہے، جن کے ذریعے ایک ''اعرابی'' نے حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کے سانحۂ ارتحال پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو تعزیت پیش کی تھی۔

اصبر نكن بك صابرين فإنما
صبر الرعية عند صبر الرأس

خير من العباس أجرك بعده
والله خير منك للعباس

نیز اس غمناک گھڑی میں وہ شعر بھی یاد آ رہا ہے، جو کسی شاعر نے ''قیس بن عامر منقریؒ'' کے مرثیہ میں کہا تھا۔ ؎

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

بلاشبہ حضرت والاؒ کی عظیم خدمات اور ہزار ہا ہزار شاگرد حضرات اُن کے لئے صدقۂ جاریہ اور حسنات میں اضافے کا ذریعہ بنیں گے۔ انشاءاللہ۔

ربِّ کریم حضرتؒ کی خدمات کو قبول فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام اہلِ خانہ و متعلقین اور متوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے ؎

اے جانے والے روح تری شاد کام ہو
حق مغفرت کرے، ترا اونچا مقام ہو

❁❁❁

کامیاب تجارت سے منافقوں کی محرومی

منافقین نے نورِ فطرت کو بجھا دیا اور اس کے عوض گمراہی مول لے لی، یہ کتنے بڑے خسارے کی بات ہے کہ اصل پونجی بھی ضائع کر بیٹھے اور نفع سے بھی یکسر محروم رہے، کامیاب تجارت تو یہ تھی کہ چراغِ فطرت جل رہا ہوتا اور اس پر مرتب ہونے والے ثمرات سے پورا استفادہ ہوتا، جب فطرت کا چراغ روشن ہوتا ہے تو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے اور ایمان کی برکت سے دنیاوی اور اخروی کمالات حاصل ہوتے ہیں۔

(حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتا پوریؒ)

مولانا مفتی شکیل احمد سیتا پوریؒ

از: ڈاکٹر تابش مہدی، دہلی

۲۴؍جولائی ۲۰۲۴ء کو ایک دوست نے سناونی دی کہ مفتی شکیل احمد قاسمی سیتاپوری بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ بڑا دکھ ہوا۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ مفتی شکیل احمد ایسے تھے بھی نہیں کہ اِس قدر جلد داغِ مفارقت دے جائیں۔ وہ تو وصل کا چراغ جلانے والوں میں تھے۔ میں نے انا للہ و انا الیہ راجعون کی تلاوت کی۔ بہت دیر تک جامد و ساکت رہا۔ پھر میرے عزیز حافظ محمد اکرم قاسمی نے سیتاپور سے نہایت رنج وغم کے ساتھ یہی خبر دی تو یقین آ گیا۔ یقین تو خیر کرنا ہی تھا۔ جو بھی اِس دنیا میں آیا ہے، وہ جانے ہی کے لیے آیا ہے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، سب کو جانا ہی ہے۔ اچانک کسی کا یہ شعر ذہن میں گونجنے لگا:

کل تو کہتے تھے کہ ہم بستر سے اٹھ سکتے نہیں
آج دنیا سے چلے جانے کی طاقت آ گئی

کئی ماہ پہلے ایک دن اچانک مفتی صاحب یاد آئے تو میں نے انھیں فون کیا تھا، محض خیریت طلبی کے لیے۔ پہلے تو گھر کے کسی دوسرے فرد نے فون اٹھایا، پھر میری گزارش پر اُنھیں فون دیا گیا۔ اُنھوں نے ہاتھ میں فون لیا۔ فرمایا: تابش مہدی صاحب! شکریہ۔ میں ذی فراش ہوں۔ بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ پھر السلام علیکم کہا اور فون بند کر دیا۔ ان کی علالت و ذی فراشی کی اطلاع تو مجھے ملتی رہتی تھی۔ کئی بار فون کے ذریعے سے رابطہ بھی قائم کیا۔ خیریت بھی دریافت کی۔ اپنی بھی خیریت سے اُنھیں آگاہ کیا۔ لیکن اتنی سنگینی کا احساس کبھی نہیں ہوا۔ ہوتا بھی کیسے، وہ ایک زندہ دل، شگفتہ مزاج، بذلہ سنج

اور ہمہ آمیز شخصیت کے مالک تھے۔ مایوسی یا ناکامی کی تو ان میں خو بو بھی نہیں تھی۔ وہ ہر وقت ہنسنے بولنے اور چہکنے والے آدمی تھی۔ نہ جانے کتنے لطائف اور زندہ رہنے والے واقعات ان کے لب شیریں پر رقص کرتے رہتے تھے۔ جس وقت کوئی واقعہ سناتے تھے، اُسی میں گم سے ہوجاتے تھے۔

مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ کا نام تو میں کافی پہلے سن چکا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ اکثر ان کی شگفتہ بیانیوں اور تدریسی انہماک کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ سیرتِ رسولؐ کے جلسوں کے اشتہارات میں بھی مقرر کی حیثیت سے ان کا نام دیکھنے کو ملتا رہا، لیکن انھیں دیکھنے، ان سے ہم صحبت ہونے یا ان کی پُرلطف گفتگوؤں سے حظّ وکیف حاصل کرنے کی سعادت اس وقت حاصل ہوئی، جب میں نے ادارۂ تجلی دیوبند کی طلب پر مستقل طور پر دیوبند کی سکونت اختیار کرلی۔ سب سے پہلے ان کی رہایش پر میں اپنے شفیق وکریم دوست بھائی حسن احمد صدیقی (حسن الہاشمی) کی معیت میں حاضر ہوا۔ اس وقت مفتی صاحب دارالعلوم کے صدر دروازے کے سامنے، دیوان دروازہ کے اندر اجلاسِ صد سالہ کے نام سے منسوب بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر رہتے تھے۔ ہر وقت ان کے ہاں دارالعلوم کے اساتذہ، بعض نمایاں اور اہل ذوق طلبہ اور شہر کے دوسرے اچھے اور سنجیدہ لوگوں کا اژدہام رہتا تھا۔ دنیا جہان کے موضوعات زیر بحث رہتے تھے۔ محیّر العقول واقعات ومشاہدات سامنے آتے تھے۔ بے شمار علما، مناظرین اور خطبا ومقررین کے بھی تذکرے سننے میں آتے تھے۔ لذّتِ کام ودہن کا بھی سلسلہ رہتا تھا۔

جب ہم پہنچے تو یہی خیال تھا کہ ہم سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی ونامعلوم ہیں۔ بھائی حسن احمد صدیقی (حسن الہاشمی) بھی یہی سوچ کر مجھے ساتھ لے گئے تھے۔ راستے میں ان کے مختلف عالمانہ وخطیبانہ اوصاف کا بیان کرتے رہے۔ میرے لیے اُن میں ان کی جملہ صفات وخصوصیات کے علاوہ سب سے بڑی کشش یہ تھی کہ وہ سیتاپوری تھے۔ سیتاپور ضلعے کا قصبہ تمبور ان کا وطن تھا۔ جس زمانے میں میں جامعہ عربیہ سیتاپور میں بہ حیثیت مجوّد خدمت انجام دے رہا تھا، تمبور کے کئی طلبہ میرے خصوصی شاگردوں میں تھے۔ تمبور کے قاری محمد ادریس نازشؔ تمبوری میرے دوستوں میں تھے، چوں کہ وہ میرے استاذِ محترم حضرت قاری شوکت علی سہارن پوری کے دوستوں میں تھے، اس لیے مجھے بہت عزیز تھے۔ وہ پیدائشی نابینا تھے۔ شاعر بھی تھے۔ نازشؔ تخلص فرماتے تھے۔ زود گوئی میں

انھیں درجۂ کمال حاصل تھا۔ فن تجوید میں بھی انھیں مہارت تھی۔ ان کا حافظہ اتنا مضبوط تھا کہ تراویح میں وہ ہر رفتار اور ہر لہجے میں تلاوت کرنے پر قادر تھے۔ انھی کی زبانی تمبور کی ایک بزرگ خاتون معلمہ، مبلغہ اور قادر الکلام شاعرہ محترمہ نازؔ تمبوری کا تعارف حاصل ہوا تھا۔ میں نے انھیں دیکھا تو نہیں تھا، وہ دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں، لیکن ان کے کلام اور گوناگوں اوصاف نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اِن تمام نسبتوں کی وجہ سے میرے دل میں ضلع سیتاپور اور قصبہ تمبور کے لیے غیر معمولی جگہ بن گئی تھی۔ وہاں کا ہر رہنے والا مجھے اپنا محسوس ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھائی حسن احمد صدیقی نے بتایا کہ مفتی شکیل احمد سیتاپور کے رہنے والے ہیں تو میں ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

ہم لوگ مفتی شکیل احمدؒ کی رہایش پر پہنچے تو وہاں پر اور لوگ بھی پہلے سے موجود تھے۔ مولانا جمیل احمد سکروڈوی کو سب سے پہلے میں نے مفتی شکیل احمد کی ہی مجلس میں دیکھا۔ سلام اور مصافحے کے بعد جب تعارف ہوا تو مفتی صاحب لفظ تابشؔ سنتے ہی اچھل پڑے۔ کھڑے ہو کر معانقہ کیا اور بہت دیر تک خوشی و مسرّت کا اظہار کرتے رہے۔ پھر حامدؔ بارہ بنکوی کا یہ شعر پڑھا:؎

اچھا ہوا کہ آپ سر بزم آ گئے
ہم لوگ کر رہے تھے ابھی آپ ہی کی بات

فرمایا: مجھے معلوم ہوا تھا کہ مولانا حسن احمد صدیقی نے ماہ نامہ تجلی اور اس کے مکتبے کی معاونت کے لیے امروہے سے کسی عامری کو طلب فرمالیا ہے۔ اس وقت میں تابش عامری کے نام سے متعارف تھا۔ مفتی صاحب نے فرمایا: آپ کا نام اور کام میرے لیے نیا نہیں ہے۔ سیتاپور کے حاجی اصغر علی اور ان کے فرزند حافظ محمد اکرم اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے تمبور کے کئی لوگ آپ کا ذکر محبت سے کرتے ہیں۔ میں بہت دنوں سے آپ سے ملنے اور آپ کا کلام سننے کا مشتاق تھا۔ یہ میری خوش نصیبی اور محترم مولانا حسن احمد صدیقی کا بے پایاں احسان ہے کہ انھوں نے ملاقات، بل کہ زیارت کا موقع فراہم کیا۔

مذکورِ بالا پہلی ملاقات کے بعد مفتی شکیل احمد سے میری کتنی ملاقاتیں رہیں، ہم لوگوں نے ایک ساتھ کہاں کہاں کا سفر کیا، کن کن جلسوں میں ایک ساتھ شریک ہوئے، یہ بتانا محال ہے۔ گرچہ ہم دونوں کا دائرہ الگ تھا اور بعض اعتبار سے ذہن و فکر میں بھی تفاوت پایا جاتا تھا، لیکن ہم میں اتنی طبعی و

مزاجی ہم آہنگی تھی کہ کبھی ملاقاتوں اور گفت وشنید میں کسی قسم کا فاصلہ نہیں محسوس ہوا۔ بعض اعاظمِ رجال واکابر کے سلسلے میں بھی ہم یک راے تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، ان کے خلفا میں حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادیؒ، حضرت مولانا شاہ سراج احمد امروہویؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سلسلے میں ہم دونوں متحد الخیال تھے۔ گرچہ وہ جماعت اسلامی سے تعلق نہیں رکھتے تھے، بہت سے مسائل میں انھیں اختلاف تھا، لیکن مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ اوران کے افکار وخیالات کے سلسلے میں وہ اُس درجے کے غالی متشدد نہیں تھے جو ہم عام مخالفین کے ہاں دیکھتے رہے ہیں۔ وہ خالص عالمانہ اختلاف رکھتے تھے اور حسب موقع اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ وہ اختلاف اور مخالفت کے فرق کو محسوس کرتے تھے۔

۱۹۸۰ء کے اجلاسِ صد سالہ کے بعد، جب ایک گروپ نے دارالعلوم پر قبضے کی کوشش کی، اس سلسلے میں دیوبند اور اس سے باہر مختلف النوع تحریکیں چلیں، ہنگامے ہوئے اور کیمپ قائم ہوئے، اس ذیل میں مفتی شکیل احمدؒ حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ مہتمم دارالعلوم کے معاون تھے اور پوری تن دہی اور مستعدی کے ساتھ وہ اربابِ دارالعلوم کے ہم راہ وہم خیال رہے اور جس بات کو حق اور صائب سمجھا، اس کا برملا اظہار کیا۔ کبھی کسی قسم کا خوف یا اندیشہ نہیں محسوس کیا۔ حتیٰ کہ فروری یا مارچ ۱۹۸۲ء میں مخالف گروپ نے جب قبضہ کرلیا تو کسی خاص گفتگو یا افہام وتفہیم کے نتیجے میں اندر پڑھانے بھی گئے، لیکن شاید کچھ ہی گھنٹوں میں وہ واپس آگئے۔ میں مذکورِ بالا حالات میں مفتی شکیل احمدؒ کا ہم خیال و ہم نوا بھی تھا اور ان کے لیے جگہوں کے لیے اپنی سی کوششیں بھی کیں۔ میری اس سعی وکاوش کا انھیں ہمیشہ احساس رہا۔ جب میں نے دہلی میں سکونت اختیار کرلی، وہ جب بھی دہلی کسی کام سے آتے تھے، مجھ سے ضرور ملنے کی کوشش کرتے تھے۔ بہت دیر تک عالمی، قومی، ملّی، مذہبی اور جماعتی موضوعات پر گفتگوؤں اور تبادلۂ خیال کا سلسلہ رہتا تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے اٹھنے کا نام نہ لیں۔

مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ ہمارے عہد کے اُن گراں قدر لوگوں میں تھے، جو بہ یک وقت کئی خصوصیات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے۔ وہ ایک محنتی اور صاحبِ علم ومطالعہ معلم ومربی تھے۔ وہ درس وتدریس کے ذریعے سے میدانِ عمل میں آئے تھے اور جب تک اس میدان میں رہے، اس

کا حق ادا کیا، ان کی محنت و توجہ اور بے لوث و بے ریا تعلیم و تربیت سے بے شمار طلبہ نے کسب فیض کیا ہے اور سب اپنے اپنے مقام پر آفتاب و ماہ تاب کی حیثیت سے دیکھے اور جانے جاتے ہیں۔ وہ درسِ نظامی کے اُن نام ور اور کام یاب اساتذہ میں تھے، جنھوں نے اپنی توجہ اور خداداد صلاحیتوں سے علم وفضل کی دنیا میں ایک بڑے طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔

مفتی شکیل احمدؒ ہندوستان میں صفِ اوّل کے خطبا و مقررین میں تھے۔ دور دور تک انھیں سیرت رسول اور تبلیغی و اصلاحی موضوعات پر خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ جہاں جاتے تھے، اپنا نقش چھوڑ کر آتے تھے۔ لوگ آئندہ کے لیے بھی ان کے منتظر رہتے تھے۔ میرا احساس ہے کہ ان کے اندازِ خطابت میں ان کے ہم وطن خطیب و واعظ، طوطیِ ہند، سلطان الواعظین حضرت مولانا ابوالوفاء عارفؔ شاہ جہاں پوری رحمۃ اللہ علیہ کا بہت گہرا عکس تھا۔ میں حضرت مولانا شاہ جہاں پوریؒ کے نیازمندوں میں رہا ہوں۔ میں نے حضرت والا کی درجنوں تقریریں مسلسل اور کسی تعطل کے بغیر سنی ہیں اور مفتی شکیل احمدؒ کو بھی بارہا سنا ہے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ متعدد جملے، ان کے لہجے کا اتار چڑھاؤ اور دورانِ تقریر میں شعر خوانی کا انداز دیکھ کر اور سن کر مجھے بے ساختہ حضرت مولانا شاہ جہاں پوریؒ یاد آ گئے۔ جب میں نے اپنے تأثر کا اظہار مفتی صاحبؒ کے سامنے کیا تو بہت خوش ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں بھی نمی محسوس ہوئی۔ واضح رہے کہ اوپر میں نے حضرت مولانا ابوالوفاء شاہ جہاں پوریؒ کو مفتی صاحبؒ کا ہم وطن لکھ دیا ہے۔ حضرت والا حقیقتاً ضلع سیتاپور کے تھے، شاہ جہاں پور میں تو وہ بہت بعد میں تشریف لائے اور وہیں رہ بس گئے۔

مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ اپنی جملہ علمی، تدریسی اور خطابتی خوبیوں کے ساتھ ایک بہت اچھے اور بلند قد انسان تھے۔ انسانیت ان کے اندر بہ درجۂ اتم موجود تھی۔ کسی انسان کی کسی قسم کی پریشانی یا تکلیف ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اسے دور کرنے کے لیے وہ مضطرب ہو جاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ کو خواہ ہم ایک معلم و مربی کے طور پر دیکھیں، خواہ موجودہ عہد کے ایک نام ور اور صاحبِ طرز مقرر و خطیب کی حیثیت سے اور خواہ ایک انسان اور سماج یا معاشرے کے ایک دردمند فرد کی حیثیت سے، ہمیں وہ ہر پہلو سے ممتاز و ممیز نظر آتے ہیں۔ ہر میدان

میں ان کی اپنی ایک پہچان ہے۔اپنی انھیں خصوصیات کی وجہ سے وہ تادیر نہ بھلائے جاسکیں گے۔

مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ دارالعلوم دیوبند کے ہونہار فرزند تھے۔انھوں نے مختلف چھوٹے بڑے اداروں میں کسبِ فیض کرنے کے بعد آخر میں دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا۔وہیں سے انھوں نے دورۂ حدیث کی بھی تکمیل کی اور افتا کی بھی۔دارالعلوم دیوبند سے سندِفراغ حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں وہ مظفرنگر سروٹ گیٹ والے مدرسے میں رہے، پھر اساتذہ وذمہ دارانِ دارالعلوم کی طلب پر ایک معلم کی حیثیت سے بھی وہیں سے جڑ گئے۔انھوں نے دارالعلوم میں ایک کام یاب و محنتی استاذ کی حیثیت سے اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ گزارا۔وہاں سے ہٹنے کے بعد انھوں نے ملک کی متعدد تعلیم گاہوں میں خدمات انجام دیں۔ضیاء العلوم تمبور میں بھی منصبِ اہتمام کو سنبھالا اور دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں بھی بہ حیثیت استاذ و مربی کافی دن گزارے اور دارالعلوم زکریا دیوبند میں بھی کچھ عرصے شیخ الحدیث رہے۔غرضے کہ وہ جہاں اور جس منصب پر بھی رہے کام یاب و نیک نام رہے۔آخر میں انھوں نے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔وہاں انھوں نے اپنا ذاتی مکان بھی بنالیا تھا اور وہیں سے ہندستان کے دور دراز کے مقامات پر تقریر وخطابت کے لیے بھی مدعو کیے جاتے رہے۔پھر وہیں سے جولائی ۲۰۲۴ء میں سفر آخرت بھی کیا۔ان کے اس سفر نے پورے ملک کے علمی و دینی طبقے کو متاثر کیا۔اخبارات ورسائل میں بھی خبریں شائع ہوئیں اور مختلف مدارس اور خانقاہوں میں بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کا اہتمام ہوا اور ان کی جدائی کو محسوس کیا گیا۔یہ قطعہ برجستہ ہوگیا تھا:

صاحبِ خلق و محبت محترم مفتی شکیلؒ
قدردانِ شعر و حکمت محترم مفتی شکیلؒ
ایک بجلی سی گری تابش! جو میں نے یہ سنا
ہو گئے رخصت جہاں سے محترم مفتی شکیلؒ

میں اپنے مخلص وکرم فرما دوست محترم مولانا مفتی شکیل احمد قاسمی سیتاپوری رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ ارتحال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہوں۔میں ان کی نوازشوں اور کرم فرمائیوں کو کبھی نہ فراموش کر سکوں گا۔اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات سے نوازے۔

دار العلوم دیوبند کے ایک قابلِ فخر فاضل
مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ

از: مولانا حکیم محمد ساجد قاسمی صدر معہد القرآن ڈمرو برسنت کبیر نگر

● ولادت: ۲۰؍مارچ ۱۹۴۸ء ● وفات: ۲۴؍جولائی ۲۰۲۴ء

یہ بات ۱۹۶۴ء کی ہے جس سال میں جامعہ عربیہ مسعودیہ نور العلوم بہرائچ پہنچا تھا اور وہاں کے ''درجۂ اولیٰ'' میں داخلہ لیا تھا، مدرسہ میں صبح وشام طلبہ کی اجتماعی دعا خوانی ہوتی ہے، ایک دن اسی موقع پر حضرت مولانا کلیم اللہ نوری صاحبؒ کارگزار مہتمم مدرسہ نور العلوم بہرائچ طلبہ کے مجمع سے روبرو ہوئے اور چند روز پہلے نور العلوم میں داخلہ لینے والے ایک طالب علم شکیل احمد سیتاپوری کو اپنے پاس بلا کر طلبہ سے مخاطب ہوئے کہ یہ جناب شکیل احمد سیتاپوری ہیں، انہوں نے پہلے نور العلوم میں پڑھنے کے بعد امسال شروع شوال میں مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور کچھ روز وہاں پڑھتے رہے، لیکن ان کا ضمیر وہاں رہنے اور پڑھنے کے لئے راضی اور مطمئن نہیں ہوا، بالآخر (بقرعید سے پہلے) یہ یہاں دوبارہ آ گئے۔ آپ لوگ نور العلوم میں رہنے سہنے اور یہاں کے اندازِ تعلیم وتربیت کی قدر کیجئے اور پوری محنت کے ساتھ اپنے مقصد میں لگے رہئے۔ یہ تھے مولانا کلیم اللہ صاحبؒ کے کلمات، جو اُس وقت نور العلوم بہرائچ کے مثالی منتظم اور بڑے باوقار وبارعب اور کامیاب مربی تھے۔

یہ بات بالکل بے غبار ہے کہ مشرقی یوپی میں نور العلوم بہرائچ تعلیم وتربیت کے لحاظ سے ایک کامیاب اور فقید المثال ادارہ رہا ہے، میں نے جس سال نور العلوم میں داخلہ لیا تھا، اُن دنوں یہ بات وہاں کے ماحول میں چرچے میں تھی کہ اب سے کچھ سال پیشتر حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

(ممتاز عالم دین اور معارف الحدیث ودیگر کتب کثیرہ کے مصنف) نے اپنے چند عزیزوں (مولانا محمد زکریا سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مولانا محمد خالدؒ) کا داخلہ یہیں دلوایا تھا۔

میں نے یہاں کے ''درجہ ثانیہ'' تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد میں ۱۹۶۵ء میں دار العلوم دیوبند چلا گیا، خیال پڑتا ہے کہ اسی سال مفتی شکیل احمد صاحبؒ بھی دار العلوم دیوبند پہنچ گئے جو مجھ سے سال دو سال پہلے کی کتابیں پڑھ رہے تھے، مفتی صاحبؒ اپنی بے پناہ خوبیوں بھر پور علمی صلاحیتوں اور عبقری اوصاف کی بنیاد پر دار العلوم میں بہت جلد چرچے میں آ گئے، شومیٔ قسمت کہ ۱۹۶۹ء میں شعبان سے پہلے ہی طلبہ اور انتظامیہ کے باہمی ٹکراؤ کے نتیجہ میں اسٹرائک ہوگئی، اور دار العلوم کی انتظامیہ اور اساتذہ بڑے بحران کا شکار ہوگئے، ان حالات میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد اسٹرائکی طلبہ کے ساتھ ہوگئی، اِس صورتحال میں سخت ضرورت تھی کہ اسٹرائک کی حمایت کرنے والے طلبہ کا ساتھ دینے سے، دوسرے طلبہ کا رخ پھیر دیا جائے، چنانچہ ایک دن مسجد قدیم میں بعد نماز عصر حضرت مولانا انظر شاہ صاحبؒ نے طلبہ کے سامنے مختصر سا پرجوش خطاب فرمایا، خطاب کے دوران حضرت کشمیریؒ اپنے کرتے کے دامن کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے لہرا رہے تھے، اور کہتے جاتے تھے کہ: عزیزانِ گرامی! یہ دامنِ سعادت ہے، جو اسے پکڑنا چاہے پکڑ لے..........

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے مختصر بیان سے طلبہ کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی حرکت وحرارت کو تیز سے تیز تر کر دیا اور طلبہ کے اندر غیر معمولی جوش بھر دیا تھا، اس کے معاً بعد طلبہ کی ترجمانی کرتے ہوئے مفتی شکیل احمد صاحبؒ کھڑے ہوئے اور چند منٹ بہت ہی پر زور اور مؤثر خطاب کیا، مفتی صاحبؒ نے اپنے خطاب میں دار العلوم کی عزت ووقار اور اساتذۂ کرام کے ادب واحترام کو موثر انداز میں بیان کرتے ہوئے سوگند کھائی کہ: ہم لوگ دار العلوم اور اپنے اساتذۂ والا مرتبت کی عزت وحرمت پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔

اس واقعہ کے بعد مفتی شکیل احمدؒ ایک نیاز منداور لائق، فائق طالب علم کے طور پر پورے دار العلوم کے حلقہ میں چرچے میں آ گئے اور آپ کی بھرپور ستائش کی گئی۔

اس اسٹرائک کو ''مجلس مشاورت'' والی اسٹرائک کا نام دیا گیا تھا، افسوس ہے کہ اس موقع پر اٹھنے والے اشتعال کو ہوا دینے اور جلتی پر گھی ڈالنے کا کام بعض ملی اور سیاسی جماعتوں کی طرف سے

کیا گیا تھا۔

مفتی شکیل احمد صاحبؒ کا دورۂ حدیث مجھ سے دو سال پہلے ہوا، مفتی صاحبؒ دورۂ حدیث میں اعلی نمبرات سے کامیاب ہوئے تھے، دورۂ حدیث کے بعد مفتی صاحبؒ نے دارالافتاء میں داخلہ لیا اور اس کے نصاب کی تکمیل کی۔

التقریر الحاوی علی البیضاوی

مفتی شکیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''موقوف علیہ'' کی مشہور کتاب ''بیضاوی شریف'' حضرت مولانا سید فخر الحسن مرادآبادیؒ سے پڑھی تھی، مولانا فخر الحسن صاحبؒ دارالعلوم کے صدر المدرسین تھے اور درجہ علیا کے انتہائی کامیاب مدرس تھے، مولاناؒ کا بیضاوی شریف کا درس بہت مشہور تھا، مفتی شکیل احمد صاحبؒ بیضاوی شریف پڑھتے ہوئے اپنی کاوش کی بنیاد پر اس پر تشریحی نوٹ قلمبند کرتے گئے، جس کا ماخذ درسی مواد قطعاً نہیں تھا، مفتی صاحبؒ اور بعد میں ان کے ساتھ مل کر مولانا جمیل احمد سکروڈویؒ (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند) نے بڑی عرق ریزی اور غیر معمولی محنت سے ''التقریر الحاوی'' کو بیضاوی شریف کی ایک کامیاب اور مکمل شرح کی شکل دی، یہ کتاب جب طباعت کے مراحل سے گزری، تو یہ کاوش مولانا فخر الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درسی افادات کے نام سے موسوم تھی، اس بات نے دارالعلوم کی علمی دنیا کو بڑی حیرت میں ڈال دیا تھا۔

میں کام کی نوعیت سے پوری طرح واقف تھا، لیکن مجھے اس ردوبدل کا علم نہیں تھا، اب سے بہت دنوں پہلے مجھے اس کا علم پاکستان کے مشہور ادیب اور مصنف مولانا ابن الحسن عباسیؒ کی تحریر سے ہوا۔

یہی صورتِ حال میرے ساتھ ''کشف الحاجۃ'' (شرح ابن ماجہ) کے تعلق سے پیش آئی تھی، جس کا طبعاً میرے جذبات واحساسات پر بڑا منفی اثر پڑا تھا۔

''کشف الحاجۃ'' کی تحریر وترتیب استاذ گرامی حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کے زیر ہدایت اور مشوروں کے تحت سراسر میری کاوش ہے لیکن ناشر نے میری جدوجہد کو حضرتؒ مولانا انظر شاہؒ کے درسی افادات کے طور پر شائع کردیا، اس سے میں بہت بددل ہوا اور اگلے حصہ پر کام کرنے کے لئے میری طبیعت آمادہ نہیں ہوئی (علاوہ ازیں ۱۹۷۷ء میں مدرسہ رحمانیہ رڑکی سے گھر

چلے آنے کے سبب کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند سے دوری بھی اس بابت ایک خاص مانع بنی) اس بات کا احساس حضرت الاستاذ مولانا انظر شاہؒ کو بھی ہو گیا اور انہوں نے اس کا نوٹس بھی لیا، چنانچہ اپنی طرف منسوب ایک کتاب ''اسماء حسنیٰ کی برکات'' مطبوعہ سنابل کتاب گھر دیوبند کی ابتدائی سطروں میں اس بات کی پوری وضاحت کردی کہ ''کشف الحاجۃ'' میرے درسی افادات کا مجموعہ نہیں، بلکہ یہ کتاب پوری طرح مولوی حکیم محمد ساجد بستوی کی کاوش ومحنت کا نتیجہ ہے۔

مفتی شکیل احمد صاحب سیتا پوریؒ متعدد فضل وکمال کی جامع شخصیت تھے

اپنے اسلاف واکابر کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے بڑے، متعدد اور مختلف فضل وکمال کے مالک گزرے ہیں، چنانچہ کچھ تو درس وتدریس کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے، کچھ نے تحریر وانشاء اور تصنیف وتالیف میں کمال پیدا کیا اور بہت سوں نے تقریر وخطابت میں اپنا لوہا منوایا۔

ہمارے اسلافِ دیوبند میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ وہ اصحاب فضل وکمال بزرگ تھے جو بیک وقت اعلیٰ درجہ کے مدرس بھی تھے، صاحب قلم اور مصنف بھی، ساتھ ہی دنیائے خطابت کے اپنے وقت کے تاجدار بھی تسلیم کئے گئے۔

بلا تشبیہ وموازنہ حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتا پوریؒ بھی ایسے ہی جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے، آپ اپنے وقت کے صف اول کے مدرس مانے گئے، چنانچہ فراغت کے معاً بعد آپ کا پہلا تقرر مدرسہ عربیہ محمودیہ سروٹ مظفر نگر میں مدرس عربی وفارسی کے طور پر ہوا، جہاں آپ نے چند سال بڑی تندہی کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دیں، اور خوب نام کمایا، کچھ ہی سال یہاں گزرے تھے کہ آپ کا تقرر مادر علمی دارالعلوم دیوبند میں ہو گیا، جہاں تقریباً دس سال تدریسی فرائض بحسن وخوبی انجام دینے کے بعد جب دارالعلوم کا قضیۂ نامرضیہ پیش آیا تو وہ یہاں سے الگ ہو گئے۔

پھر جب ۱۹۸۰ء میں مخدوم گرامی حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ نے مشرقی یوپی کا اپنا مشہور ادارہ ''دارالعلوم الاسلامیہ'' قائم فرمایا تو مفتی صاحبؒ دارالعلوم الاسلامیہ تشریف لے آئے اور برسوں یہاں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔

جن دنوں مفتی شکیل احمد صاحبؒ یہاں مقیم رہے، وہ ماہ وسال دارالعلوم الاسلامیہ کے زرّیں دور کہلانے کے مستحق ہیں، اُن دنوں کے مدرسین میں مفتی صاحبؒ کے علاوہ ممتاز عالم دین اور مایۂ ناز مفتی جناب مولانا مفتی محمد افضل حسین قاسمیؒ، مولانا نثار احمد صاحبؒ، مولانا ظہیر انوار صاحب مدظلہ، اور مخدوم زادۂ گرامی قدر جناب مولانا محمد اسعد قاسمی صاحب دام فیضہ مدیر مجلّہ فکر اسلامی دارالعلوم الاسلامیہ بستی وغیرہ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

مفتی شکیل احمد صاحبؒ ایک شعلہ بیان مقرر اور خطیب بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیان وخطابت کا ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے جلسوں میں آپ کی شرکت کو اجلاس کی کامیابی کا ضامن سمجھا جاتا تھا۔

عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحبؒ آپ کے خطاب وبیان کے غیر معمولی قدرداں، بلکہ گرویدہ تھے، حضرت باندویؒ کی ایسے موقع پر یہ خواہش ہوتی تھی کہ مفتی صاحبؒ کا بیان مکمل طور پر (ٹیپ ریکارڈر میں) محفوظ کیا جائے، مجھ سے مفتی صاحبؒ نے خود بتایا کہ اس مقصد کے لئے حضرت باندویؒ نے اپنی جیب خاص سے ٹیپ ریکارڈر خریدنے کا انتظام فرمایا تھا، مفتی صاحبؒ کے بیانات کے متعدد مجموعے خاص طور پر ''دیکھنا تقریر کی لذت......'' دو جلدوں میں کتابی شکل میں شائع ہوئے جو ہر طبقہ میں غیر معمولی طور پر پسند بھی کئے گئے۔

مفتی شکیل احمد صاحبؒ شگفتہ مزاج، باذوق اور تحریر وانشاء کی بھرپور صلاحیت کے مالک تھے، چنانچہ دارالعلوم الاسلامیہ کے ترجمان مجلّہ ''فکر اسلامی'' میں دیگر مضامین کے علاوہ اس کا تفسیری کالم ''معارف الکتاب'' بھی روزِ اول سے وہی لکھتے تھے جو بڑا فکر انگیز اور انتہائی معلومات افزا ہوتا تھا۔

حضرت مولانا مفتی شکیل احمد صاحبؒ بڑے باغ وبہار شخص تھے، اللہ نے انہیں عام پذیرائی اور ہر دلعزیزی غیر معمولی عطا فرمائی تھی، جس مجلس میں بھی ہوتے، اپنے کمالات کی بنا پر چھا جاتے، بذلہ سنجی، خوش مزاجی، مفتی صاحبؒ میں بھرپور تھی، ایسی پُرکشش شخصیت کے لوگ خال خال نظر آتے ہیں، اسی لئے جہاں بھی وہ ہوتے تھے اپنے قدردانوں کے حلقہ میں ہوتے، جہاں بیٹھتے صدرِ مجلس ہوتے اور مجمع کو زعفران زار بنائے رہتے۔ اللهم اغفر له وارحمه واجعل الجنة مثواه.

❁❁❁

اُنہیں ڈھونڈو اب چراغِ رخِ زیبا لے کر

از-مولانا مفتی محمد یحییٰ قاسمی
استاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرد آباد
وسابق استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

جس دور میں احقر مشرقی یوپی کی عظیم دینی درسگاہ ''دار العلوم الاسلامیہ بستی'' میں بحیثیت استاذ حاضر ہوا تھا اس وقت وہاں لائق وفائق اور باکمال اساتذہ کی ایک جماعت تھی، جنہیں بانیٔ مدرسہ حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے اپنی مردم شناس مزاج وطبیعت سے مختلف جگہوں سے منتخب کر کے اپنے نیک نام وفعال ادارے میں جمع کرلیا تھا، کبھی کبھار اساتذہ کا یہ گروہ اتفاقاً بعد نماز عصر مسجد کے مین گیٹ کے سامنے کھڑا ہوجاتا تھا تو وہ منظر دیدنی ہوتا تھا۔

دار العلوم الاسلامیہ میرے پہونچنے سے پہلے ہی وہاں کے ایک باکمال استاذ وصدر مفتی، مجمع العلوم والفنون، جامع الحسنات والکمالات، صلاح وصلاحیت کے حامل، علم وعمل کے پیکر حضرت مولانا مفتی محمد افضل حسین صاحب جوارِ رحمت میں پہونچ چکے تھے، لیکن اس دور میں موجود اساتذہ میں ایک سے بڑھ کر ایک ذی علم، ذی استعداد علماء تھے، ہر ایک کی قدر وعظمت میرے دل میں موجود تھی اور ہے، لیکن مجھے کہنے اور لکھنے میں کوئی جھجھک اور کوئی تامل نہیں کہ میرے دورانِ تدریس یہاں موجود اساتذہ میں علمی لحاظ سے سب سے اونچا قد بلا کسی نزاع واختلاف کے حضرت مولانا مفتی شکیل احمد صاحب سیتا پوریؒ کا تھا۔

پورا مدرسہ حضرتِ والا کی قابلیت کا قائل تھا، طلبہ ان کے سبق کے گُن گاتے تھے، اربابِ انتظام وانصرام بھی ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میرا ماننا ہے کہ کسی ادارے میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جنہیں اپنی روزی روٹی کیلئے ادارے کی ضرورت ہوتی ہے اور کچھ لوگ اپنی لیاقت وقابلیت کی بنیاد پر اس سے اونچا اُٹھ کر ادارے کی ضرورت بن جاتے ہیں۔ بلاشبہ ہمارے مفتی صاحبؒ اسی دوسرے زمرے میں آتے تھے، ادارے سے ان کی شناخت نہیں ہوئی بلکہ ادارے نے ان سے شناخت پائی۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ادارے سے کم، ادارے نے ان سے زیادہ شہرت پائی، حتیٰ کہ بہتوں کو یہ کہتے سنا یا گیا ’’مفتی شکیل صاحب سیتاپوری کا مدرسہ‘‘۔

مختصر المعانی اور مشکاۃ المصابیح جیسی فنی کتابیں حضرت مفتی صاحبؒ کے زیر درس رہتی تھیں، ان کی درسی تقریر بڑی جامع، مقنع اور سہل الممتنع ہوتی تھی، غبی سے غبی طالب علم ان کے سبق سے آسودہ اٹھتا تھا، افہام وتفہیم کا بڑا عجیب وغریب ملکہ تھا، حضرت والا کا دور ’’دار العلوم الاسلامیہ بستی‘‘ کے لئے دورِ مسعود تھا، اسی دور میں دار العلوم الاسلامیہ بستی کی علمی شہرت بامِ عروج تک پہونچی، سب سے عمدہ طلبہ کی کھیپ حضرت والا کے دور ہی میں تیار ہوئی۔ تدریس کے گھنٹے حضرت والا کے صرف صبح میں ہوتے تھے، شام کا وقت حضرتِ والا کا فارغ رہتا تھا، مسجد کے مین گیٹ کے بالائی حصے پر حضرت والا کی درسگاہ تھی، مسجد کے قریب سے گذرنے والے ہر شخص کو حضرتِ والا کا سبق بآواز بلند صاف سنائی دیتا تھا۔

ہمارے حضرت مفتی صاحبؒ کی عوام الناس میں مقبولیت ومحبوبیت کا یہ عالم تھا کہ احقر نے سنا ہے کہ جب حضرتِ والا کو ان کے علاقے تمبور سیتاپور سے دار العلوم الاسلامیہ بستی بمشکل تمام لایا گیا تو علاقے کے لوگ بسوں میں بھر کر حضرتِ والا کو واپس لے جانے کیلئے دار العلوم الاسلامیہ بستی پہونچ گئے، جنہیں سمجھا بجھا کر بمشکل تمام رخصت کیا گیا، ظاہر ہے کہ اس طرح کی مقبولیت ومحبوبیت کے نظارے اس ناقدری دنیا میں اب کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

تدریس کے بعد حضرتِ والا کی ذات میں جس چیز نے چار چاند لگائے وہ ہے تقریر وخطابت۔ ایک مقرر کا کمال یہ ہوتا ہے کہ سامعین کے قلوب کو مسخر کرلے، مجمع پر چھا جائے، مجمع چھوڑ کر جانا تو

در کنار کوئی مجمع سے ملے بھی نا، مقرر کی گھنٹوں کی تقریر لوگوں کو لگے اب شروع ہوئی ہے، یہ خوبیاں حضرتِ والا کے بیان میں بوجہِ اتم پائی جاتی تھیں، وہ زبان وقلم کے بے تاج بادشاہ تھے، ان کا بیان جادو اثر ہوتا تھا، ان کا بیان استعارات وکنایات اور تشبیہات کا حسین مرقع ہوتا تھا، الفاظ ومعانی پر ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ گویا وہ دونوں ان کے زرخرید غلام ہوں، جو ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے ہوں۔ دورانِ تقریر برمحل اتنے اشعار پڑھنے والا خطیب کم از کم میں نے تو نہیں دیکھا، ایک جلسے میں حضرت کے ساتھ شرکت کا اتفاق ہوا تو حضرت کو دیکھا کہ آغازِ خطاب میں اپنے داعی کو موضوع بنا کر کافی دیر تک سامعین کو محظوظ کیا، حضرتِ والا کی عوام میں تقریر اتنی مقبول ومحبوب تھی کہ ان کی جلسے میں شرکت جلسے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی، حضرتِ والا کے نام پر لوگ پروانہ وار جلسہ میں شریک ہوتے تھے، حضرتِ والا کی تاریخیں بھی بڑی مشکل سے ملا کرتی تھیں۔ تقریر کا یہی ملکہ آپ کو لندن وکنیڈا وغیرہ جیسے دور افتادہ ممالک لے گیا اور اسی کے بدولت آپ ڈاکٹر ذاکر نائک کے ٹی وی چینل تک بھی پہونچے۔

اللہ بہت بہت جزائے خیر دے جنیدِ وقت عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ کو کہ انہیں کے ایماء واشارے پر حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی تقاریر کے ذخیرہ کو کتابی شکل میں بنام ''دیکھنا تقریر کی لذت'' دو جلدوں میں جمع کر دیا ہے، شروع کتاب میں خطیبوں سے کچھ گزارشات کی گئیں ہیں، پھر مختلف موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب طلبہ وعلماء کیلئے نہایت مفید ہے۔

بعض مرتبہ کسی ادارے کے اساتذہ وملازمین تنخواہ بڑھوانے کی یا کوئی اور مراعات انتظامیہ سے حاصل کرنے کی اسکیم بناتے ہیں، لیکن یہ اسکیم اس وقت فلاپ اور ناکام ہو جاتی ہے جب مرحلہ آتا ہے کہ ''بلی کو گھنٹی کون پہنائے'' یعنی ذمہ دار اعلیٰ کے سامنے بات کون رکھے، لیکن اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کی قبر کو نور سے بھر دے کہ وہ اس طرح کے کاموں کیلئے ہمہ تن وہمہ دم تیار رہتے، اپنی اور اساتذہ وملازمین کی باتیں انتظامیہ کے سامنے بڑی مضبوطی سے رکھتے اور عام طور پر انتظامیہ سے بات منوا ہی لیتے، حضرتِ والا کے دار العلوم الاسلامیہ بستی سے تشریف لے جانے کے بعد ایسا خلا

پیدا ہوا جو آج تک پُر نہ ہو پایا۔

حضرت مفتی صاحبؒ مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے، میں نے تدریس کے سات سالہ دورانئے کے دوران انہیں کبھی افسردہ نہیں دیکھا، وہ ہنستے تھے اور ہنساتے تھے گویا ان کا ایمان تھا ؎

صیاد خوش دلی میں ہے کچھ زندگی کا لطف
افسردہ خاطروں کیلئے خزاں کیا ؟ بہار کیا؟

اسی لئے ان کی مجلس سدا، سدا بہار رہتی تھی، لطیفوں کا تو اُن کے پاس پشتارہ تھا، معمولی سے معمولی لطیفہ میں اپنے اسلوب و انداز سے ایسا رنگ بھرتے کہ مجلس قہقہہ زار بن جاتی۔

راقم الحروف کو اپنے بارے میں نہ تو کبھی یہ خیال آیا کہ وہ بہت ہوشیار و چالاک ہے اور نہ کبھی یہ خطرہ و کھٹکا دل میں گزرا کہ وہ ذکی و ذہین ہے، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اللہ رب العزت نے مجھے اپنے مقصد میں لگے رہنے کی عظیم نعمت عنایت کی ہے جس کیلئے میرے جسم کا رواں رواں اللہ کا شکر گزار رہتا ہے، میں نے دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں رہ کر بھی خوب محنت کی، اپنی درسگاہ کو اپنا دارالمطالعہ بنایا جب کہ وہاں کے ماحول کیلئے یہ چیز نئی تھی، عام طور پر وہاں کے اساتذہ کی قیام گاہ ہی ان کی مطالعہ گاہ تھی، صرف حضرت مولانا مفتی مبارک حسین صاحب دامت برکاتہم مطالعہ کیلئے اپنے دارالافتاء تشریف لایا کرتے تھے، مجھے اس طرح محنت کرتا دیکھ کر حضرت مفتی صاحبؒ مجھ سے فرماتے ''بہت اچھا لگتا ہے آپ کو اس طرح محنت کرتا دیکھ کر، لیکن صحت کا خیال رکھنا''، میں نے حضرتِ والا کی اس نصیحت پر کتنا عمل کیا اور کتنا عمل کر رہا ہوں یہ الگ بات ہے، لیکن ان کے اس جملے سے اپنے ایک نہایت چھوٹے سے کتنا تعلقِ خاطر جھلکتا بلکہ چھلکتا ہے، اسی ایک جملے میں کس قدر حوصلہ افزائی بھی ہے اور وعظ و نصیحت بھی۔

میرا گھر دارالعلوم الاسلامیہ بستی سے ۶۰-۶۵ رکلومیٹر کے فاصلے پر ہے، اس لئے دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں رہتے ہوئے میری یہ قلبی خواہش رہتی تھی کہ ادارے کے اکابر علماء و اساتذہ کے مبارک قدم میرے گھر اور گاؤں میں پڑ جائیں لیکن ع

کوئی تقریب تو بہرِ ملاقات چاہئے

میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہمیشہ رہتا تھا، حسن اتفاق کہئے کہ برادرِ عزیز حافظ محمد ارشد سلمہٗ کا ولیمہ تھا، میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر دیگر اکابر اساتذہ دار العلوم الاسلامیہ بستی کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں بھی دعوت پیش کی، نہ یہ کہ حضرتِ والا نے دعوت قبول فرمائی، بلکہ چند ایسے جملے انہوں نے ارشاد فرمائے جو اُن کی خردنوازی کی ایک بہترین مثال ہیں، حضرتِ والا نے ارشاد فرمایا ''ویسے تو میرے گھر ''لکھنؤ'' جانے کی ترتیب تھی، لیکن اپنے اور غیروں میں فرق ہوتا ہے، غیروں کے یہاں موقع ہو تب جایا جاتا ہے، لیکن اپنوں کے یہاں جانے کیلئے وقت نکالا جاتا ہے، میں ضرور آپ کے گھر چلوں گا، لکھنؤ جانا اگلے ہفتے تک کیلئے ملتوی کرتا ہوں''۔

حضرت مفتی صاحبؒ اور دیگر اساتذہ میری حقیر دعوت پر میرے گاؤں اور میرے گھر تشریف لائے، گاؤں میں عید ساسماں تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ ہمارے گاؤں تشریف لائے ہیں، واپس آتے آتے انہوں نے یہ کہہ کر میرا حوصلہ بڑھایا کہ ''اسلامیہ کو ایک اور کام کا آدمی مل گیا''۔

کچھ سال قبل جب مجھے یہ علم ہوا کہ حضرتِ والا بحیثیت استاذ دار العلوم زکریا ٹرانسپورٹ نگر مرادآباد تشریف لائے ہیں تو میں اپنے چند رفقائے کار کے ہمراہ زیارت وملاقات کے واسطے وہاں حاضر ہوا، حضرت مفتی صاحبؒ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئے اور ایک عربی شاعر کا وہ شعر جو عامۃً بلغاء فن بدیع کی مشہور اصطلاح ''جناس تام'' کی مثال میں پیش کرتے ہیں:

مَامَاتَ مِنْ كَرَمِ الزَّمانِ فَإِنَّهُ   يَحْيَا لَدَىٰ يَحْيَى من عَبْدِ اللهِ

زمانے سے کرم ناپید نہیں ہوا ہے، کیونکہ وہ یحییٰ بن عبد اللہ کے یہاں موجود ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے ان تشجیعی کلمات سے میں کبھی غرور اور زعم میں مبتلا نہ ہوا، بلکہ میرے مولیٰ نے ہمیشہ یہ سمجھنے کی توفیق دی کہ یہ بڑوں کی خردنوازی ہے، اس طرح کہہ کر بڑے اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتے ہیں۔

حضرتِ والا وسیع المطالعہ تھے، چونکہ وہ غیر منقسم دار العلوم دیوبند میں استاذ بھی رہ چکے تھے، اس لئے ان کے علم میں بلا کی پختگی تھی، لہٰذا کسی بھی علمی مجلس میں کسی سے مرعوب ومتاثر نہیں دیکھے گئے، انہیں گفتگو کرنے کا بڑا ملکہ اور سلیقہ تھا، دار العلوم الاسلامیہ بستی کے اربابِ انتظام وانصرام کسی

بڑی مہم پر نکلتے تو نہ یہ کہ صرف حضرت مفتی صاحبؒ کو ہمراہ لے جاتے، بلکہ آپ ہی کو متکلم بناتے، آپ لوگوں کے سامنے ادارے کی بہترین ترجمانی فرماتے۔

دو تین سال مسلسل بیمار رہ کر آسمان علم وعمل کا یہ ستارہ سال رواں کے ۱۷ رمحرم الحرام ۱۴۴۶ھ بمطابق ۲۴ رجولائی ۲۰۲۴ء کو ہمیشہ ہمیش کیلئے غروب ہو گیا، ان کی وفات پوری ملت اسلامیہ کا بڑا خسارہ اور نقصان ہے، ان کی وفات نے ہزاروں متعلقین ومحبین کو غمگسار کر دیا۔ ایک زمانہ تھا جب راقم السطور نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جس کے ساتھ بھی زندگی کے دو چار دن گذرے ہوں گے، اِن کی نماز جنازہ میں ضرور شرکت کروں گا اور حضرت مفتی صاحبؒ تو میرے بہت بڑے محسن تھے، میری حوصلہ افزائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے، اس تعلق کی بنا پر حضرت کی تجہیز وتکفین میں میرے لئے شرکت لابدی تھی، لیکن ملازمت میں ہزاروں تحفظات ہوتے ہیں، ملازمت گویا پیر میں بیڑی اور ہاتھ میں زنجیر ہے، اس لئے چاہ کر بھی شرکت نہ ہو سکی۔ اللہ تعالیٰ حضرتِ والا کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

○❖○

ایمان بالغیب کسے کہتے ہیں

ایمان بالغیب یہ ہے کہ غیبی حقیقتوں کی دل سے تصدیق کی جائے، زبان سے ان کا اقرار کیا جائے اور عمل سے ان کا اظہار کیا جائے، اوران حقائق کا سامنا کرنے کے خوف اور اپنی کم مائیگی کے احساس سے ہر وقت لرزہ براندام رہا جائے ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ)

تدریس وخطابت کے فردِ یگانہ

از: مولانا قاری احمد سعد قاسمی
بانی وناظم المعہد العلمی الاسلامی دیوبند
وسابق استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

حضرت مولانا مفتی شکیل احمد صاحب سیتا پوری راہئ آخرت ہوگئے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو رحمت ومغفرت کی چادر سے ڈھانپ لے۔

مفتی شکیل احمد صاحبؒ باغ وبہار آدمی تھے، ظرافت کا عنصر ان کے اندر غالب تھا، مجلس میں میرِ مجلس بن جاتے، محفل ان کی ظرافت ولطافت، چٹکلوں اور چٹکیوں سے زعفران زار بن جاتی، مزاج میں نظافت، فکر ونظر میں توسع تھا، خُرد وکلاں سب ان سے گھل مل جاتے۔

دوسری طرف ان کے علم ونظر میں بڑی وسعت تھی، مطالعہ کے رسیا تھے، مطالعہ بھی سرسری وسطحی نہیں بلکہ کتب عربی وفارسی کے مراجع کا مطالعہ کرتے، قوی حافظہ کے مالک تھے، تقریروں میں پوری پوری عبارت پڑھتے چلے جاتے، تدریس، تصنیف اور خطابت تینوں میں ان کو امتیاز حاصل تھا جن میں سے ہر ایک میدان میں انہوں نے اپنا لوہا منوایا اور شہرت ومقبولیت نے ان کے قدم چومے۔

وہ نہایت جید الاستعداد تھے، میزان سے لیکر بخاری تک معقول ومنقول کی کوئی بھی کتاب پڑھانے کی پوری اہلیت رکھتے تھے، اردو شرح کے استمداد سے مکمل بے نیاز تھے، متن وحاشیہ سے ہی

معانی کی تہ تک پہونچ جاتے تھے، پھر مزید برآں تفہیم کا زبردست ملکہ تھا، ان کا درس دار العلوم دیوبند اور دیگر مدارس میں جہاں بھی وہ منصب تدریس پر جلوہ فگن ہوئے مقبول ترین درس تھا، مولانا جمیل احمد سکروڈوی مرحوم جو دنیائے تدریس کا مشہور ومقبول نام ہے مفتی صاحبؒ کے معاصر وخواجہ تاش تھے بلکہ بعض کتابوں میں شریک درس تھے، ناقدانہ طبعیت کے مالک تھے مگر مفتی صاحب کی صلاحیتوں کے زبردست مداح تھے، تدریس وعبارت فہمی میں ان کو فرد مانتے تھے، ان کی تدریسی اور تالیفی صلاحیت کا نمونہ تفسیر بیضاوی شریف کی شرح ''التقریر الحاوی'' اور سلم العلوم کی شرح ''میزان العلوم'' میں دیکھا جاسکتا ہے، مفتی صاحبؒ بحیثیت مقرر وخطیب کے بڑی شہرت کے حامل تھے، پُر جوش مقرر تھے لگاتار بولتے اور پوری فصاحت وبلاغت سے ہمکلام ہوتے، فصیح وبلیغ تعبیرات زباں سے پھسلتی چلی جاتیں، ہنساتے بھی، رُلاتے بھی، اور ساتھ ہی غالبؔ واقبالؔ، اکبرؔ وحالیؔ اور سوداؔ کے اشعار دست بستہ ان کے سامنے کھڑے رہتے، برمحل وبرجستہ پیش کرتے چلے جاتے، اسی لئے ان کی تقریریں بڑی مقبول تھیں، جہاں وہ رہتے اطراف سے مسلسل مطالبے آتے، ان کی تقاریر پر مشتمل ایک کتاب بنام ''دیکھنا تقریر کی لذت'' (اول، دوم) مطبوعہ ہے، حقیر کاتب سطور کیساتھ خاص شفقت وکرم فرمائی کا معاملہ فرماتے۔ پہلے دُور سے ہی سنا تھا، پھر جب احقر کا تقرر شمالی ہند کی مشہور دینی درسگاہ معروف ومقبول مدرسہ دار العلوم الاسلامیہ بستی، میں ہوا تو (سبب تو حضرت الاستاذ مولانا قاری ابوالحسن صاحب اعظمی تھے مگر اندر سے مفتی صاحب مرحوم کی سعی مشکور بھی تھی) اس وقت مفتی صاحب کو قریب سے دیکھنے اور براستفادے کا خوب موقع ملا، ان کی جذّاب شخصیت، پُر بہار انداز، اخلاق عالیہ، ہنسنے ہنسانے کا ملکہ ہمہ وقت اپنی طرف کھینچے رہتا، دار العلوم الاسلامیہ کے ناظم، ادارے کے بانی ومہتمم نہایت کریم النفس انسان حضرت مولانا باقر حسین صاحبؒ کے فرزند اکبر حضرت مولانا محمد اسعد صاحب قاسمی دام ظلہ ہیں جو بذات خود خوش ذوق، مرنجامرنج پُر بہار وخاندانی مزاج ومذاق کے حامل ہیں، مفتی شکیل احمد صاحبؒ سے ان کی بڑی گہری دوستی تھی، بعد نمازِ عصر اکثر ودیگر اوقات میں بھی مجلس جمتی اور خوب جمتی، دنیا جہان کی باتیں، عجیب وغریب شگوفے چھوڑتے، علمی وتاریخی باتیں، واقعات وقصص سبھی طرح کی چیزیں آتیں۔ ع

دامان نگہ تنگ وگل حسنِ تو بسیار- والی بات تھی

مدرسے میں اُس وقت کئی بڑے نامور اساتذہ جمع تھے! مفتی شکیل احمد صاحبؒ کے علاوہ حضرت مولانا نثار احمد صاحب قاسمی بستویؒ جو شروع سے ہی بانی محترمؒ کے ساتھ رہے، باوقار وخوش مزاج، ذی استعداد استاذ تھے، صدارتِ تدریس کے منصب پر بھی فائز تھے، تیسری شخصیت حضرت مولانا مفتی افضل حسین صاحب بستویؒ کی تھی جو اپنی اعلیٰ درسی وفقہی استعداد کے ساتھ تقویٰ وطہارت میں فردِ یگانہ تھے، حقیر کو ان سے بھی خاص مناسبت رہی، کافی استفادے کا موقع ملا، غرض گلہائے رنگارنگ سے چمن کی زینت دوبالا تھی، مفتی شکیل صاحبؒ اس میں میرِ محفل تھے، سب مل کر بیٹھتے تو معاملہ سہ آتشہ ہوجاتا۔ ؎

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یاد گار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

اس کی ایک وجہ ان کی خردنوازی کے علاوہ والد مرحوم حضرت مولانا ارشاد احمد صاحبؒ سابق مبلغ دارالعلوم دیوبند تھے، والد صاحبؒ ہی مفتی صاحبؒ کو ان کے وطن تمبور سے دیوبند لائے تھے، دیوبند میں بھی وہ قریب رہے، اور ہمارے ماموں وخسر مولانا مسعود احمد صاحب ہاشمیؒ اور مفتی صاحبؒ دونوں ہم درس تھے، اس لئے گھر پر آمد ورفت کثرت سے رہی۔ مفتی صاحبؒ والد صاحبؒ کے ساتھ بعض اسفار میں بھی رہے، غرض یہ ایک سبب بھی تھا ان کی شفقت وذرہ نوازی کا۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی خدمات کو شرفِ قبول عطا فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ (آمین)

○❖○

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

از-مولانا شاہد علی قاسمی

مہتمم مدرسہ ضیاء العلوم تمبور، سیتاپور، یوپی

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ۔ (صحیح مسلم)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاد فرمایا کہ جب انسان کی وفات ہوجاتی ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، مگر کچھ چیزوں کا فیض مرنے والے کو پہنچتا رہتا ہے۔ صدقۂ جاریہ، دوسرے وہ علم جس سے نفع ہورہا ہو، تیسرے نیک اولاد جو اُس کے حق میں دعا کرے۔

حضرت مولانا مفتی شکیل احمد صاحبؒ کی شخصیت انہیں اوصاف وکمالات کا مجموعہ تھی، ان کی باتیں علمی ہوا کرتی تھیں، ان کا علمی ورثہ قیامت تک باقی رہے گا۔ چند سطروں میں حضرت مفتی صاحبؒ کے کارناموں کو بیان نہیں کیا جاسکتا ؏

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

اس کے لئے سیکڑوں صفحات درکار ہیں، حضرت مفتی صاحبؒ جہاں ایک طرف درس وتدریس میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے وہیں فنِ خطابت میں بھی ان کا طرزِ بیان سب سے منفرد تھا۔

ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے مدرسہ ضیاء العلوم میں حاصل کی اور فارسی وعربی کے کچھ درجات وہیں پڑھے، پھر مدرسہ نور العلوم بہرائچ میں تعلیم حاصل کی، مظاہر علوم سہارنپور میں بھی کچھ دنوں پڑھنے

کے بعد دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور امتیازی نمبرات سے فراغت کے بعد وہیں سے افتاء بھی کیا، مفتی صاحبؒ کی علمی استعداد اتنی پختہ تھی کہ آپ کے اساتذہ آپ کو بہت مانتے تھے، خاص طور پر دار العلوم کے صدر المدرسین حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحبؒ کی نظر عنایت آپ پر اتنی زیادہ تھی کہ دار العلوم سے فراغت کے بعد انہوں نے مدرسہ محمودیہ سروٹ مظفر نگر میں آپ کو تعلیمی خدمت انجام دینے کیلئے بھیج دیا اور پھر دار العلوم میں آپ کا تقرر ہو گیا۔ احقر نے بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس رہ کر درجہ چہارم، پنجم اور ششم کی تعلیم حاصل کی، حضرت مفتی صاحبؒ کے پڑھانے کا انداز نرالا تھا، طلبہ کو دورانِ سبق ہی زیادہ تر سبق کا حصہ یاد ہو جاتا، حضرت مفتی صاحبؒ دار العلوم کے مایۂ ناز اساتذہ میں رہے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند اور ان کی انتظامیہ کے وفاداروں میں تھے، جب دار العلوم کے حالات ناسازگار ہوئے اور اس پر دوسرے گروپ کا قبضہ ہو گیا تو وقف دار العلوم کا قیام عمل میں آیا اُس وقت مفتی صاحبؒ نے سال ڈیڑھ سال وہاں پر درس دیا، اور اس کے بعد دار العلوم حیدرآباد تشریف لے گئے، اور دو سال تک علمی خدمات انجام دیتے رہے، اس درمیان میں وطن واپسی کی اور مدرسہ ضیاء العلوم تمبور کی ذمہ داری آپ کو دی گئی، آپ نے اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی نبھایا، آپ کے دورِ اہتمام میں مدرسہ ضیاء العلوم نے ہر میدان میں بہت ترقی کی، پھر دار العلوم الاسلامیہ بستی تشریف لے گئے اور ایک عرصۂ دراز تک وہاں تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے، دار العلوم زکریا دیوبند اور دار العلوم زکریا مراد آباد میں بھی شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز رہے۔

پھر کچھ دنوں بعد لکھنؤ میں مستقل رہائش اختیار کر لی اور پوری زندگی علمی مشغلہ میں گذار دی، اخیر دور میں صاحبِ فراش ہو گئے اور بیماری نے آپ کو ایسا گھیرا کہ ۲۴ ر جولائی ۲۰۲۴ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ تدفین قبرستان عیش باغ لکھنؤ میں ہوئی، پسماندگان میں چار لڑکے، دو لڑکیاں ہیں۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ باری تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور شاگردوں کا جو جمِ غفیر آپ نے پیچھے چھوڑا ہے، یہی نجات کا ذریعہ بنے۔　　○❖○

آہ! استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی شکیل احمد صاحبؒ

از: مولانا مفتی سعید الرحمٰن قاسمی استاذ دارالعلوم الاسلامیہ بستی

استاذِ محترمؒ کے اوصاف حمیدہ

استاذِ گرامی قدر حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ بے شمار خوبیوں کے مالک اور گونا گوں اوصاف کے حامل تھے، آپؒ کے اندر شرافتِ نفسی، بے نیازی، اخلاق مندی، رجال سازی، زبان کی شائستگی، اسلاف کی میراث سے وفاداری، اسلامی تہذیب وتمدن کی پاسداری، افکار ونظریات میں پاکیزگی تحریر وتقریر میں بے خوفی و بے باکی بدرجۂ اتم موجود تھی، آپ کو مبدأ فیاض کی طرف سے خود اعتمادی، خودداری، احساس ذمہ داری، ظرافت وذہانت، فہم وفراست، اصول پسندی، ہمدردی اور دردمندی کے اوصاف وافر مقدار میں حاصل تھے، چنانچہ آپ جس ادارے میں تدریسی خدمات انجام دیتے اس کے تفوق وبلندی کے لئے ہمہ جہت کوشاں رہا کرتے تھے، نیز اس کی درودیوار تک سے ان کی محبت، وارفتگی اور اپنائیت ان کی گفتگو اور تقریروں سے جھلکتی اور معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت الاستاذ نے ایک جلسۂ عام میں دوران خطاب دارالعلوم الاسلامیہ بستی اور اس کے بانی معمارِ قوم وملت کا تذکرہ کرتے ہوئے سامعین سے فرمایا ''حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک قائد اور رہبر دیا ہے جنہوں نے صرف ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں آپ کی ناک اونچی کی ہے اور آپ کا بول بالا کیا ہے، اخلاص، دیانت، شرافت، ہمدردی، انسانیت نوازی، کونسی چیز ہے جو ان میں موجود نہیں ہے ؎

مزہ برسات کا چاہو تو اِن آنکھوں میں آبیٹھو
سیاہی ہے، سفیدی ہے، شفق ہے، ابرِ باراں ہے

یہ اُن کا سوزِ جگر اور اخلاص تھا، اخلاص کی تاثیر یہ ہے کہ "من أخلص لله أربعين يوماً ظهرت ينابيع الحكمة على لسانه" چالیس دن تک اگر کوئی اخلاص سے کام کرے تو اُس کی

زبان سے حکمت کے چشمے اُبلتے ہیں۔

اِنہوں نے اخلاص کے ساتھ یہ ادارہ دارالعلوم الاسلامیہ قائم کیا تو بستی جیسے کوردہ شہر میں کہ جس میں بدعات تھیں، رسومات تھیں، جہالتیں تھیں، اوہام کا پہرا تھا، اِس مدرسے کو قائم کرنے کے بعد انہوں نے ''صحیح عقیدے'' کا جھنڈا گاڑ دیا، پورے شہر کی تہذیب کو بدل کر رکھ دیا ہے اِس مدرسے نے، پورے شہر کی ثقافت پر اِس مدرسے نے اپنا اثر ڈالا ہے، شہر کی جس سڑک پر آپ نظر ڈالئے اُس سڑک پر ٹوپی، کرتے اور پائجامے والے لوگ آپ کو نظر آئیں گے، پہلے جب دیہات کے مسلمان بستی شہر میں جاتے تھے تو اوپرا پن، اجنبیت اور وحشت محسوس کرتے تھے اور اِس وقت ان کو قطعاً اجنبیت اور وحشت محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنائیت محسوس کرتے ہیں، یہ سب اِس مدرسے کا ثمرہ اور برکت ہے جس کو حضرت مولانا نے اپنے خونِ جگر سے سیراب کیا ہے''۔ (معمار قوم وملت حضرت اقدس مولانا محمد باقر حسین قاسمیؒ ص:۱۰۵)

حضرت الاستاذؒ دارالعلوم الاسلامیہ میں بحیثیت ممتحن

میری یادداشت کے مطابق حضرت الاستاذؒ دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں اولاً بحیثیت ممتحن بلائے گئے، ان دنوں بندہ درجہ عربی اول کا طالب علم تھا، آپ کے ذمہ کئی درجات کے طلبہ کا امتحان تھا مگر ہمارے درجہ کی اہم کتاب میزان الصرف کا امتحان حضرت الاستاذ کے متعلق ہوا، ہم طلبہ کو آپ کا طریقۂ امتحان انوکھا معلوم ہوا کیونکہ آپ نے سارے طلبہ کو امتحان کے لئے بلالیا جو ہمارے لئے ایک نئی بات تھی اور ایک نیا انداز تھا، پھر آپ نے سارے طلبہ سے یکے بادیگرے متعدد سوالات کئے اور اپنی چھان پھٹک سے ادنیٰ قسم کے طلبہ کو جانے کی اجازت مرحمت فرمائی، بعدہٗ اوسط و اعلیٰ قسم کے طلبہ کے درمیان سوالات کا سلسلہ جاری ہوا یہاں تک کہ ان کے مابین حد امتیاز اور فرق مراتب کو پرکھتے اور جانچتے ہوئے اوسط درجہ کے طلبہ کو رخصت کردیا پھر اعلیٰ درجہ کے طلبہ سے سوال وجواب کا آغاز ہوا اور ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے کے بعد آپ نے اُنہیں کو اعلیٰ نمبرات سے سرفراز فرمایا، یہ طریقۂ امتحان مجھے اتنا پسند آیا کہ آج تک میرے دل کی تختی پر نقش ہے، اور یہی وہ بابرکت لمحہ تھا جب ہم طلبہ دارالعلوم الاسلامیہ نے حضرت الاستاذ کا پہلی مرتبہ دیدار کیا اور پھر مشیتِ ایزدی کے فیصلہ سے مادرِ علمی میں تشنگانِ علوم نبوت کی پیاس بجھانے کے لئے حضرتؒ کا بطور مدرس تقرر عمل میں آیا۔

حضرت الاستاذؒ دار العلوم الاسلامیہ میں بحیثیت استاد

دار العلوم الاسلامیہ کی انتظامیہ کی ہمہ جہت چوکسی، اساتذۂ کرام کی جد و جہد اور سعیٔ متواصل اور طالبان علوم نبوت کے غیر معمولی حصول علم میں انہماک کی بنا پر دار العلوم الاسلامیہ اطراف عالم میں شہرت یافتہ ہو چکا تھا، لیکن جب حضرت الاستاذؒ کا تقرر عمل میں آیا اور آپ تدریسی منصب پر جلوہ افروز ہوئے تو طلبہ میں نئی امنگ، جوش، ولولہ اور جذبۂ اندروں میں مزید اضافہ ہوا! الحمد للہ بندے کو حضرتؒ سے تلخیص المفتاح اور مختصر المعانی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، حضرتؒ کا درس کتاب کے مشکل ہونے کے باوجود اتنا آسان اور سہل ہوتا تھا کہ طلبہ اسے حلوۂ تر سے کم نہ گردانتے تھے، کیونکہ آپ کو مشکل اور سخت سے سخت مسئلہ کو آسان انداز میں سمجھانے کا ملکہ حاصل تھا اس لئے کہ ان کو خداوندِ قدوس نے الفاظ مترادفہ کی کثرت، استعارات و تمثیلات اور زبان زد عوام و خواص کے محاوروں اور قدیم و جدید تعبیرات پر پورا عبور عطا کیا ہوا تھا غرضیکہ آپ کے منفرد تدریسی انداز نے دار العلوم الاسلامیہ بستی کو شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا۔

حضرت الاستاذؒ درس گاہ میں

حضرت الاستاذؒ درس گاہ میں بڑی متانت و سنجیدگی، اطمینان و سکون اور باوقار انداز میں تشریف لاتے اور مسند درس پر متمکن ہو جاتے، کبھی کبھی درس گاہ کے نظم و نسق اور صفائی و ستھرائی پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے، اگر درس گاہ میں کوئی چیز بے ڈھنگی اور بے ترتیب ہوتی، مثلاً تپائی ٹیڑھی ہوتی یا کچھ تنکے ادھر ادھر پڑے دکھائی دیتے تو نظم و نسق، ترتیب اور صفائی ستھرائی کی طرف طلبہ کو توجہ دلاتے، طلبہ عبارت خوانی میں اگر غلطی کرتے تو ٹوکتے اور عبارت کی تصحیح فرماتے، نیز آپ کی عادت تھی کہ طلبہ میں مطالعہ کا ذوق پیدا کرنے کی غرض سے گاہے بگاہے استفسار کرتے کہ کس کس طالب علم نے سبق کا مطالعہ کیا ہے؟ مطالعہ نہ کرنے والے طلبہ کو تنبیہ بھی کرتے اور انھیں مطالعہ کے فوائد اور اس کی اہمیت سے روشناس کرتے، غرضیکہ آپ درس گاہ میں طالب علم کو حقیقی معنی میں طالب علم اور درس گاہ کو درسگاہ دیکھنا ہی پسند کرتے تھے کہ طلبہ اس کا ادب ملحوظ رکھیں، اس کے تقدس کو پامال نہ کریں کیونکہ یہی علوم و فنون کے آبیاری کی جگہیں ہیں۔

حضرت الاستاذؒ میدانِ خطابت میں

حضرت الاستاذؒ اپنے متنوع اوصافِ حسنہ اور خصائلِ حمیدہ کے ساتھ ساتھ ایک باکمال وبافیض مقرر وخطیب اور بے مثال واعظ تھے، آپ دل نشیں، مفصل ومدلل اور عام فہم خطیبانہ صلاحیتوں کے بے تاج بادشاہ تھے، علم حدیث وفقہ پر عبور کامل کے ساتھ علم کلام سے تعلق خاطر تھا، اشعار سے بڑی دلچسپی تھی یہ سارے کمالات آپ کی تقریروں سے اظہر من الشّمس تھے، چنانچہ آپ کے خطابات قرآن وحدیث، علمِ فقہ، علمِ کلام اور بامعنیٰ اشعار پر مبنی ہوا کرتے تھے، آپ اپنی گوناگوں صلاحیتوں کے ساتھ خطیبانہ صلاحیت میں بھی ملکی سطح پر مشہور ومعروف تھے، چنانچہ ضلعی، صوبائی اور ملکی وغیر ملکی جلسوں، اجتماعات اور پروگراموں میں آپ کی شرکت کو جلسہ کی کامیابی تصور کیا جاتا تھا، عرض آپ کے وعظ ونصیحت کے ذریعہ بے شمار بندگانِ خدا نے توبہ کرکے اسلامی زندگی اختیار کی اور وہ نوجوان جو اسلام سے برگشتہ ہوگئے تھے، اسلام کی طرف راغب ہوگئے، اور تائب ہوکر اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہوئے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی وہ خطیبانہ صلاحیت عطا کرے تاکہ ہم سے بھی استاذ محترم کی طرح کچھ دینی کام ہوسکے۔

حضرت الاستاذؒ تحریری میدان میں

دارالعلوم الاسلامیہ کے ترجمان اور اس کے مؤقر رسالہ ''فکر اسلامی'' میں مسلسل آپ کی تحریرات، مضامین اور مقالات آتے رہے نیز آپ نے طالبان علوم نبوت کے اندر خطابی اور تقریری صلاحیت اور مہارت پیدا کرنے کی غرض سے بڑی اہم اور وقیع کتاب ''دیکھنا تقریر کی لذت'' تحریر فرمائی یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے، دونوں میں خاص خاص عنوانات پر تقریریں ہیں جو طلبہ، علماء، ائمہ ومؤذنین اور دینی کام کرنے والوں کے لئے یکساں مفید وسودمند ہیں۔ نیز آپؒ نے تفسیر بیضاوی کی شرح ''التقریر الحاوی'' کے نام سے تصنیف فرما کر قرآنی علوم ومعارف کے جواہر پیش کئے اور فن منطق کی مشکل ترین کتاب سلم العلوم کی شرح ''میزان العلوم'' لکھ کر فلسفہ اور منطق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نایاب تحفہ عطا فرمایا ہے۔ یہ حضرتؒ سے متعلق چند یادداشتیں تھیں جو زیر قرطاس ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کی مغفرت فرما کر اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے۔ (آمین)

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

❀❀❀

ملتِ اسلامیہ کا ایک درخشندہ ستارہ

از: مولانا محمد افضل حسین قاسمی استاذ دار العلوم الاسلامیہ بستی

اِس دنیائے فانی میں جو بھی آیا یہاں رہنے کے لئے نہیں بلکہ وہ اپنی حیاتِ مستعار مکمل کر کے عالم فانی سے عالم بقا کی طرف چلا ہی گیا، یہ سلسلہ ابتدائے دنیا سے اب تک جاری ہے اور تا قیامت ضابطۂ خداوندی اور اصول قرآنی "کل نفس ذائقة الموت" کے مطابق چلتا رہے گا البتہ جانے والے مختلف قسم کے افراد واشخاص ہوتے ہیں اس طور پر کہ کسی کے متعلقین ومحبین کو اس کے جانے کا احساس کم ہوتا ہے اور کسی کو زیادہ۔

ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتا پوریؒ سابق استاذِ تفسیر وحدیث دار العلوم الاسلامیہ بھی ان عظیم، صاحب فن اور باکمال ہستیوں میں سے ایک ہیں، جن کے جانے کا رنج عامة المسلمین خصوصاً طبقۂ علماء وطلباء کو زیادہ ہے، ان کے رخصت ہونے سے اُن حضراتِ علماء وطلباء کو غیر معمولی رنج اور احساس ہے جنھوں نے حضرت والاؒ سے کچھ عرصہ تک فیض یابی کا شرف حاصل کیا ہے، حضرت والاؒ اپنے اوصاف وکمالات کی بنا پر ہر خاص وعام میں انتہائی درجہ کی مقبولیت اور شہرت پائے ہوئے تھے۔

ذوقِ مطالعہ

آپ علم دوست اور کتاب دوست شخصیت کے مالک تھے جن کے شب وروز کا مشغلہ لکھنا

پڑھنا اور کتابوں کی ورق گردانی کرنا تھا، کتب بینی اور کتاب دوستی کا یہ عالم تھا کہ اخیر عمر بیماری کے ایام میں گھر کے اندر دو لوگ آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہوئے نظر آئے، اس حال میں بھی ایک ہاتھ سے اپنا دامن اور دوسرے ہاتھ سے کتاب کا دامن تھامے ہوئے تھے، اس منظر نے ناظرین کو حیرت واستعجاب میں ڈال دیا، آپ کا شمار بلاد ہند و پاک کے ان ممتاز اور نامور خطیبوں میں ہوتا ہے کہ جب خطابت کے میدان میں اترتے تو محسوس ہوتا کہ الفاظ وتعبیرات حضرت والاؒ کے سامنے باادب دست بستہ کھڑے ہیں، کیونکہ مضامین اس قدر روانی کے ساتھ اُن کی زبان پر آتے کہ جملوں اور تعبیرات میں بیحد ندرت اور یکسانیت ہوتی، میں کہتا ہوں کہ اگر سانس لینا مجبوری نہ ہوتی تو مضمون مکمل ہونے تک مسلسل بغیر ٹھہرے بولتے چلے جاتے تھے، حقیقت یہ کہ جو بھی صاحب قلم حضرت کی زود بیانی، زورِ کلام اور خطابت کی خصوصیات لکھے گا آخر میں اسے یہ کہنا ہوگا کہ آپ کی خطابت کی خصوصیت لکھنے سے نہیں بلکہ براہ راست دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، الغرض آپ کے کلام میں سنجیدگی، متانت، آواز کا زیر و بم اور سحر انگیزیٔ طرز بیان ایسی عظیم خوبیاں تھیں جو سامعین کے قلوب پر گہرا نقش چھوڑنے کا کام بخوبی انجام دیا کرتی تھیں۔

تدریسی خصوصیت

آپ نے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ درس وتدریس اور افادۂ عام میں گزار دیا اور ملک کے عظیم اور مختلف مدرسوں میں ہزاروں طلبہ نے اُن سے مستفید ہو کر اپنی علمی پیاس بجھائی، جن اداروں میں حضرت نے تدریسی خدمات انجام دیں اُن میں خصوصیت سے ام المدارس دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم الاسلامیہ بستی قابل ذکر ہیں، اور دارالعلوم الاسلامیہ بستی بایں معنی لائق تذکرہ ہے کہ جتنا طویل عرصہ احاطۂ دارالعلوم الاسلامیہ میں آپ کا گزرا ہے اتنا کسی اور ادارے میں نہیں گذرا۔

یہ حقیقتِ واقعہ ہے کہ جب آپ دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں اسباق پڑھانے کے لئے درسگاہ کی طرف بارعب اور باوقار انداز میں قدم رنجہ فرماتے تو طلبہ میں آپ کی ہیبت ورعب کی وجہ سے سناٹا چھا جاتا، طلبہ عموماً آپ کے روبرو ادباً واحتراماً سر جھکا لیتے تھے، مسندِ درس پر جلوہ افروز

ہوتے ہی سلام کے بعد چند سیکنڈ کتاب مختصر المعانی کے حاشیہ و متن پر سرسری نظر ڈالتے، بعدۂ طلبہ سے مخاطب ہو کر بآواز بلند فرماتے ''چلو عبارت پڑھو'' ایک طالب علم کم از کم دو صفحہ عبارت خوانی کرتا اس کے بعد حضرت والا اپنے خاص و نادر انداز میں عبارت کی ایسی تشریح و توضیح فرماتے کہ ہر طالب علم مطمئن ہو جاتا، اور کسی طرح کا کوئی اشکال و اعتراض اس کے ذہن میں باقی نہ رہتا، بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت والاؒ کو بفضلہ تعالیٰ افہام و تفہیم کا جو حیران کن ملکہ عطا ہوا تھا وہ دوسروں میں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ مختصر المعانی جیسی کتاب اور اس کی عبارت جس کا سمجھنا ایک عام مدرس کے لئے انتہائی مشکل ہے چند لمحات میں اس کی غیر معمولی پیچیدہ عبارتوں کو حل کرنا اور اس کی گتھیوں کو سلجھانا حضرت والاؒ کا خاص فن اور حصہ تھا۔

دارالعلوم الاسلامیہ بستی کی تدریسی زندگی میں حضرت والاؒ پہلے گھنٹے میں مختصر المعانی پڑھایا کرتے تھے، درمیان سال موسم گرما میں طلبہ جب درسگاہ میں پہنچتے تو رات میں نیند مکمل نہ ہونے کی بنا پر اکثر طلبہ پر سستی کے آثار اور نیند کا خمار نمایاں ہوتے تو اس موقع پر طلباء کی غفلت و بے پروائی اور سبق پڑھنے سے بیزاری کو دیکھ کر طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے ایک عجیب بات فرماتے جسے سن کر حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ''ارے پگلو! مجھ سے مختصر المعانی پڑھ لو ورنہ مجھ سے پرانا مختصر پڑھانے والا پورے ہندوستان میں کوئی تمہیں نہیں ملے گا''۔ آگے فرماتے کہ: ''مسلسل ۲۵ سال سے پڑھا رہا ہوں''۔

حضرت والاؒ کا یہ جملہ آج بھی بندہ کے دل و دماغ میں نقش کالحجر ہے، جب کہ کان کے پردے سے ٹکرائے ہوئے تقریباً ۲۰ سال کا عرصہ گزر گیا۔

بہر حال مفتی صاحبؒ جب تک دارالعلوم الاسلامیہ بستی میں مقیم رہے تو اس کی ایک الگ شان تھی، اور جب کسی مجبوری کی وجہ سے ''یہاں'' سے رخصت ہوئے، تو ادارے کے در و دیوار یہ منظر پیش کر رہے تھے کہ ؎

بچھڑا کچھ اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

اور اب جب کہ بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جو کائنات کے ہر متنفس کے لئے مقدر ہے، تو

حضرتؒ نے اپنی حیاتِ مستعار اس دنیا میں پوری کر کے داعئ اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کسی کہنے والے نے ایسے ہی لوگوں کی شان میں کہا ہے کہ: ؎

اے فرشتۂ اجل کیا خوب تھی تیری پسند

پھول تو نے وہ چنا جو گلشن کو ویراں کر گیا

ایک مرتبہ ڈنمارک میں ہم مسلمانوں کی مذہبی کتابِ مقدس ''قرآنِ کریم'' کی شان میں سخت گستاخی اور تمام مسلمانوں کی دل خراشی کی گئی تھی، جس کی بنا پر دنیا بھر میں مسلمانوں کے دلوں کو ٹھیس پہونچی، اُس وقت عالم اسلام میں جگہ جگہ احتجاجات ہوئے اُسی موقع پر شہر بستی میں بھی اعلیٰ پیمانے پر احتجاجی مظاہرہ ہوا، جس میں شہر کے مسلمانوں کا جم غفیر تھا، گورنمنٹ انٹر کالج میں کثیر تعداد میں اہلِ ایمان جمع تھے، جس میں دارالعلوم الاسلامیہ بستی کے جملہ اساتذہ وطلبہ بھی شریک تھے، اور وہیں سے بڑے پیمانے پر جلوس کی شکل میں احتجاج اور مظاہرہ کرتے ہوئے برادرانِ ملت بآواز بلند مختلف الفاظ میں ڈنمارک کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے پکّہ بازار (گاندھی نگر) کے شاہراہِ عام سے گذرتے ہوئے کچہری میں ڈی، ایم آفس کے سامنے پہونچے، وہاں حضرت مفتی صاحبؒ نے ایسی جوشیلی اور ولولہ انگیز تقریر کی جس سے مظاہرے میں شریک ہر فرد کے دل میں ایک آگ سی لگ گئی، اور وہ شعلۂ جوالہ بن کر اٹھی، اب کیا تھا لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھے اور وہ تھامے نہیں تھم رہے تھے، اُس وقت کا منظر واقعتاً قابل دید تھا لوگ اپنے مشتعل جذبات کو قابو میں نہیں لا پا رہے تھے، اس غم وغصہ اور جذبات کے عالم میں مسلمانوں کے ہجوم نے ڈنمارک کے خلاف ''اسلام زندہ باد ڈنمارک مردہ باد'' اور اس جیسے دوسرے الفاظ میں جو نعرہ بازی کی اس سے کچہری اور اس کے اطراف واکناف کا پورا علاقہ نعروں سے گونج اٹھا خلاصۂ کلام یہ کہ حضرتؒ نے عوام وخواص کے دلوں میں اپنی تقریر سے ایک جوشِ ایمانی بھر دیا تھا۔ حق تعالیٰ اُن کو غریقِ رحمت کرے۔ (آمین)

❁❁❁

مرثیہ

برسانحۂ ارتحال معلمِ باکمال، خطیبِ بے مثال، صاحبِ طرز مؤلف، نمونۂ اسلاف، بابصیرت عالمِ ربانی حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری نور اللہ مرقدہٗ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند ودارالعلوم الاسلامیہ بستی، یوپی۔

از: مولانا مفتی حفیظ اللہ قاسمی بستوی
ناظم تعلیمات جامعہ سراج العلوم بھیونڈی، مہاراشٹر

جس کے شہکاروں کی اک فہرست ہے کافی طویل — جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
جسکے چہرے سے عیاں تھی ہیبتِ علم وادب — پُرسکوں تھا جس سے ہر ہنگامۂ شور وشغب
وہ معلم بے بدل تھا اور خطیبِ بے مثیل — جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
وقت کا سحبان تھا وہ پیکرِ ضرب المثل — اس کی تالیفات ہیں سب مشعلِ راہِ عمل
ڈالتا تھا بیخِ باطل میں وہ حق کی نکیل — جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
جس کے اندازِ خطابت کی الگ پہچان تھی — ہر ادائے دلربا دہلیز کی دربان تھی
دیکھنے آتی تھی دنیا، منظرِ طرزِ جمیل — جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
علم وفن، فکر ونظر کا بحر نا پیدا کنار — ہوگیا جنت روانہ سب کو کرکے اشکبار
محرمِ قرآن وسنت طالبِ اجرِ جزیل — جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
مثنوی رومیؔ کا حافظ دفعتاً جاتا رہا — شیخ سعدیؔ کے تخیل پر جو بل کھاتا رہا
عاشقِ اقبال وشیرازی تھا مردِ بے عدیل — جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
چھیڑتا تھا جب کبھی وہ جام وپیمانے کی بات — میکشوں کے لڑکھڑاتے پاؤں پاتے تھے ثبات

خوبر وساقی کی نظروں میں تھی حق کی سلسبیل | جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
بے شمار اشعار ہر لمحہ رہے نوکِ زباں | ہاں تلاطم خیز پیہم تھا یہ دریائے رواں
آہ! رخصت ہوگیا ام المدارس کا سپوت | جس سے تھراتے رہے طاغوت وباطل کے کپوت
دو بدو ہوکر انہیں کرتا تھا جو خوار وذلیل | جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
ناظمِ دارالعلوم اسلامیہ اور مہتمم | محوِ غم استاذ و طلبہ اور سارے منتظم
ہیں ظہیرؔ واسعدؔ واسجدؔ جسے کھوکر علیل | جاوداں ہوکر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
اہلِ خانہ کو سنبھالیں کیسے طارق اور شمیم | عالمِ اسلام کے دل میں ہے اِک صدمہ مقیم
تھی مسلّم ذاتِ عالی مرتبت بے قال و قیل | جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
دم بخو داس موت سے سب اہل سیتا پور ہیں | سارے اسلاف واکابر سر بسر رنجور ہیں
شاہراہِ دینِ فطرت کا وہ تھا،اک سنگِ میل | جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
ملتِ بیضا کے کاندھے پر ہے اک بارِ گراں | کیفیت ہردل کی ہے ایک ایک چہرے سے عیاں
کھودیا امت نے جرأتمند ودانا اک کفیل | جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
دینِ حق کا ترجماں ناگاہ رخصت ہوگیا | قبر کی آغوشِ راحت میں یکا یک سوگیا
اب ہمارے بیچ آنے کی نہیں کوئی سبیل | جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
یا الٰہی جنت الفردوس میں کردے مکیں | اک ترے در پر شکیل احمد رگڑتا تھا جبیں
بس ترا ہی فضل ہے درکار اے ربِّ جلیل | جاوداں ہوکر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل
اے حفیظؔ آؤ گے کیا اُس وقت ہی تم ہوش میں | زندگی سوجائے گی جب موت کی آغوش میں
نیک بن جاتو بھی قبل از مرگ اے میرے خلیل | جاوداں ہو کر گیا دنیا سے وہ مفتی شکیل

☆☆☆

مقرر، ایک شعلہ بار تھے مفتی شکیل احمدؒ

از: جناب رہبر پرتاپ گڑھی پرنسپل وویکا نند انٹر کالج مانپور، بسواں، سیتاپور

خدا کے بندۂ بیدار تھے مفتی شکیل احمدؒ
بدی سے برسرِ پیکار تھے مفتی شکیل احمدؒ

انہیں رہتی تھی ہمدردی، نکوکاروں سے، اچھوں سے
بُروں کے حق میں بس تلوار تھے مفتی شکیل احمدؒ

مقرر تھے، مبلغ تھے، محدث اور مفسر بھی
مگر جو کچھ بھی تھے، خود دار تھے مفتی شکیل احمدؒ

عدو سے بھی رہی ہوگی عداوت یہ بھی ممکن ہے
مگر یاروں کے تو بس یار تھے مفتی شکیل احمدؒ

کیاہے نام سیتا پور کا روشن زمانے میں
میاں! تمبور کا مینار تھے مفتی شکیل احمدؒ

بزرگوں سے سنا ہے ایک اچھے آدمی بھی تھے
بظاہر ہی نہیں، دیں دار تھے مفتی شکیل احمدؒ

اُنہیں اک جلسۂ پرتاپ گڑھ میں دیکھا تھا رہبرؔ
مقرر، ایک شعلہ بار تھے مفتی شکیل احمدؒ

خطبات

خطیب العصر حضرت مولانا

مفتی شکیل احمد قاسمی سیتاپوریؒ

چند نمونے

- مؤمن کا کردار
- چار زندگیاں: قرآنِ کریم کے آئینے میں
- تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا

مؤمن کا کردار

از: مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوری

{ماہ اکتوبر ۱۹۹۸ء کے اوائل میں راقم سطور کے ہمراہ برادرِ مکرم خطیب العصر حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند و دارالعلوم الاسلامیہ بستی کا ایک دعوتی سفر دبئی کا ہوا تھا، وہاں قیام کے دوران سب سے پہلا فکر انگیز خطاب ''مؤمن کے کردار'' کے اہم ترین موضوع پر ۲ر اکتوبر کو نماز جمعہ کے بعد مسجد السلام دبئی میں ہوا تھا۔ جس میں وہاں مقیم ہندوستانی علمائے کرام اور عام مسلمانوں کے علاوہ بطور خاص عصری تعلیم یافتہ طبقے اور خواتینِ اسلام کی ایک قابلِ ذکر تعداد شریک تھی، عزیزم مولوی حافظ مسعود الرحمٰن ندوی بستوی سلمہ اللہ العزیز نے انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے اس کو نقل کیا اور خطاب کی اہمیت وافادیت کے پیشِ نظر ہمارے رفیقِ کار عزیز مکرم مولانا امتیاز احمد قاسمی صاحب زیدت معالیہم نے جو ماشاء اللہ خود بھی صاف ستھرا علمی وادبی ذوق رکھتے ہیں، بڑے سلیقہ سے اسے مرتب کر کے ذیلی عناوین کا بھی اضافہ کیا۔

دونوں کے شکریے کے ساتھ افادۂ عام کی غرض سے اس کو مجلّہ ''فکر اسلامی'' میں شائع کیا جا رہا ہے۔} **(مدیر)**

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

محترم علماء کرام اور دیگر حاضرینِ جلسہ اور محترم بھائیو اور بہنو!

رسولِ اکرم ﷺ کی ایک اہم سنت: کردار کی مضبوطی

رسولِ اکرم ﷺ کی ایک سیرت، ایک عادتِ مبارکہ اور ایک سنت کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں، جس کی طرف اہلِ علم کا ذہن جاتا ہوگا لیکن عام حضرات کا ذہن اُس کی طرف نہیں جاتا،

حالانکہ وہ بہت اہم پہلو ہے اور اتنا اہم پہلو ہے کہ اگر اُس کو نظر انداز کر دیا جائے اور امت اُس کی طرف توجہ نہ کرے تو بنیادی کام انجام ہی نہیں پاسکتے۔

بڑا سے بڑا منصوبہ، بڑی سے بڑی اسکیم، بڑا سے بڑا اِقدام، بڑی سے بڑی تحریک، اُس سنت کو پیش نظر رکھے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی، وہ کیا سنت ہے؟ وہ کیا طریقہ ہے؟ وہ کیا صفت ہے؟ آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ بڑے سے بڑے منصوبے ایک آدمی کے کردار کی خامی کی وجہ سے فیل ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں کردار کی صلابت اور پختگی کی اہمیت

جماعت میں ایک آدمی کا کردار خام ہوتا ہے، کردار میں پختگی نہیں ہوتی تو بڑے سے بڑے منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں ؎

چوں از قومے یکے بیدانشی کرد
نہ کہہ را منزلت باید نہ مہ را

اگر قوم میں سے ایک آدمی بے دانشی کا شکار ہوتا ہے تو چھوٹے اور بڑے سب کی عزت کو وہ لے کر ڈوب جاتا ہے ؎

نمی بینی کہ گاوے در علف زار
بیالاید ہمہ گاوانِ دِہ را

اگر ریوڑ کی ایک گائے کسی کھیت میں منھ مارتی ہے تو تمام گایوں کو کانجی ہاؤس میں پہنچادیا جاتا ہے، کردار کی پختگی، کردار کی مضبوطی، کردار کی صلابت، کردار کی سختی، کردار کا کھراپن، یہ رسول ﷺ کا بنیادی وصف تھا۔ یہ رسول ﷺ کی سنتِ ظاہرہ تھی! کردار کس کو کہتے ہیں؟ کردار کی پختگی کے کیا معنیٰ ہیں؟ کردار کے معنیٰ یہ ہیں کہ امتحان کے وقت، آزمائش کے وقت پورا اترنا، زہد کی آزمائش ہوتی ہے کہ قدموں میں دولت ڈھیر کردی گئی اور ایک نگاہِ غلط انداز آپ اُس پر نہ ڈالیں یہ ہے زہد کی آزمائش، یہ ہے کردار کی پختگی، آپ قاضی ہیں، اپنے وقت کے اور اپنے بیٹے کا مقدمہ آپ کے سامنے پیش ہوا، اُس وقت آپ کے عدل کی آزمائش ہے، عام انسانوں کے بارے میں عدل قائم کرنا اور انصاف کو

برپا کرنا اور عدل کا جھنڈا بلند کرنا یہ آسان ہے لیکن لختِ جگر کے بارے میں قلم چلانا اور نورِ نظر کے خلاف فیصلہ دے دینا یہ ہے آزمائش کا مرحلہ، اس کو کہتے ہیں کردار، امتحان کے موقع پر اعلیٰ اقدار کی حفاظت کرنا، اس کو کردار کی پختگی کہتے ہیں اور اس کی قوموں کی زندگی میں سخت ضرورت ہے یہ اگر نہ ہو تو بڑا سے بڑا منصوبہ فیل ہو جاتا ہے ؎

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے
عشق ہے کارے شیشہ و آہن

شریعت انسان کو فولاد بنانا چاہتی ہے

شریعت ایسے موقع پر انسان کو فولاد بنانا چاہتی ہے، شیشے کو فولاد سے ٹکرا دینا، طبیعت کا شیشہ چور چور ہو جائے لیکن شریعت کا لوہا اپنی جگہ پر رہے، تو کردار کی پختگی امتحان کے موقعوں پر جانچی جاتی ہے، عند الرِّھان تُعرفُ السوابق. یوں تو ہر گھوڑا تیز رفتار ہوتا ہے لیکن جب گھوڑ دوڑ کا موقع آتا ہے، امتحان کا موقع آتا ہے تو اُس وقت جانا جاتا ہے کہ کونسا گھوڑا زیادہ تیز رفتار ہے، اسی کو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

ایمان کی آزمائش کے مواقع

مادیت کا چاروں طرف دور دورہ ہے اور آپ کے ایمان کی آزمائش ہے، اُس وقت ایمان پر قائم رہنا یہ ایمان کی آزمائش ہے، سب مؤمن بیٹھے ہیں اُس وقت ایمان کے گُن گانا، یہ تو آسان کام ہے لیکن بُت خانے میں اذان دینا یہ کردار ہے، اجنبی کے بارے میں انصاف کرنا یہ آسان کام ہے، لیکن بادشاہ کے خلاف فیصلہ دینا یہ کردار ہے، جہاں منفعت اور مضرت کا کوئی پہلو نہ ہو وہاں حق پر قائم رہنا آسان ہے اور جہاں مضرتیں ہی مضرتیں ہوں اور منفعت کو نقصان پہنچ رہا ہو، اُس وقت حق کا جھنڈا بلند کرنا اُسے کردار کہتے ہیں، نبی ﷺ کا یہ ذاتی وصف تھا یعنی کردار کی پختگی، چنانچہ آپ ﷺ

نے فرمایا لو زنیٰ ابن ملکھم رجموہ ولو سرق قطعوہ. کہ صحابہ میں کردار کی پختگی اتنی ہے کہ اگر شہزادہ زنا کا شکار ہو جائے تو اُس کو سنگسار کئے بغیر نہیں چھوڑیں گے اور اگر اُس سے چوری سرزد ہوئی تو اُس کا ہاتھ کاٹ دیں گے، یہ ہے اُن کے اندر کردار کی صلابت، یہ ہے کردار کی پختگی، اِس میں نفس مرتا ہے، اِس میں آرزوئیں فنا ہوتی ہیں، اس میں خواہشات وارمان پر دھبہ لگتا ہے، لیکن انسانی اقدار بلند ہو جاتی ہیں اور تاریخ اُس سے مرتب ہوتی ہے چاہے مفادات پر چوٹ پڑتی ہو، چاہے قرابتوں پر ضرب لگتی ہو اور چاہے ارمانوں کا خون ہوتا ہو ؎

یہ صحن وروش یہ لالہ وگل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں

خواہشات پر جب ضرب پڑتی ہے تب حق بلند ہوتا ہے، جب قرابتوں پر ضرب پڑتی ہے تب حق بلند ہوتا ہے، تو صحابۂ کرامؓ اور تابعینؒ کی یہی شان تھی، اُن میں کردار کی صلابت اور پختگی بہت تھی، صحابہؓ اور تابعینؒ کا نام لیا جائے تو آپ کہیں گے کہ وہ دور ہی کچھ اور تھا لیکن اب بھی اسلام کردار کے مثالی نمونے دنیا کے سامنے لاسکتا ہے ؎

یہ نغمہ فصلِ گل ولالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا إلـٰه إلا الله

اسلام مُردہ نہیں ہوا ہے، قرآن بانجھ نہیں ہے

اسلام سدا بہار درخت ہے، ہمیشہ اُس میں پھل آتے رہیں گے، قرآن ہمیشہ باکردار انسان پیدا کرتا رہے گا، یہ اللہ کی وہ کتاب ہے جو بانجھ نہیں ہے، اس سے کام کے افراد پیدا ہوتے رہیں گے ؎

سلام اُس ذات پر جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالدؓ وحیدرؓ کے افسانے

اسلام مردہ نہیں ہے، قرآن بانجھ نہیں ہوا ہے، اب بھی اِس قرآن کو پڑھنے والے کردار کا وہ

مظاہرہ کرتے ہیں کہ دنیا ششدر رہ جاتی ہے اور بادشاہ انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں۔

مولانا عبدالرحیم رامپوریؒ کا عظیم کردار

ابھی سو سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مدرسہ عالیہ رامپور میں فقہ، اصولِ فقہ اور عربی زبان وادب کے ایک فاضل اور ممتاز استاذ حضرت مولانا عبدالرحیم رامپوریؒ ہوا کرتے تھے، وہاں وہ ایک زمانے سے زہد وقناعت کے ساتھ طالبانِ علومِ نبوت اور اہلِ رامپور کو فیض یاب کر رہے تھے، دنیا اور اسبابِ دنیا کی طرف اُن کا قطعاً میلان نہ تھا، اُن کا عجیب وغریب واقعہ جو اُن کے عظیم کردار پر دلالت کرتا ہے یہ ہے کہ اُسی دوران روہیل کھنڈ (بریلی، رامپور اور مرادآباد) کے انگریز حاکم (گورنر) مسٹر ہاکنس نے بریلی میں ایک کالج قائم کیا اور اس کالج میں عربی زبان وادب کی تعلیم کے لئے مولانا عبدالرحیم رامپوریؒ کا انتخاب کیا اور ان کی ماہانہ تنخواہ ڈھائی سو روپئے مقرر کی اور یہ کہا کہ کچھ دنوں کے بعد اس میں اضافہ کرتے ہوئے تین سو روپئے کر دیئے جائیں گے لیکن مولاناؒ نے انکار فرما دیا اور یہ کہا کہ مجھے نوابِ رامپور کی طرف سے دس روپئے ماہوار ملتے ہیں وہ بند ہو جائیں گے۔ تو انگریز حاکم نے کہا میں اس کا پچیس گنا زیادہ دے رہا ہوں تو آپ اس دس روپئے کی فکر کیوں کرتے ہیں؟ تو مولانا نے ایک اور بات کہی کہ میرے گھر کے آنگن میں بیری کا ایک درخت ہے جس کے بیر بہت میٹھے ہوتے ہیں وہ مجھ کو بہت پسند ہیں، مجھے وہ بریلی میں کہاں ملیں گے؟ ظاہر بیں انگریز حاکم اب بھی اُن کے دل کی بات نہ پاسکا اُس نے کہا کہ بریلی سے رامپور کتنی دور ہے؟ اس کے روزانہ لانے کا انتظام کر دیا جائے گا، اور ہر روز تازہ بیر آپ کے گھر والے آپ کو بھیج دیا کریں گے، تو انہوں نے فرمایا ٹھیک ہے، ایک اور بات ہے وہ یہ کہ ملک کے مختلف علاقوں یعنی بہار اور بنگال وغیرہ کے طلبہ جو مجھ سے علم حاصل کر رہے ہیں وہ بے فیض اور محروم رہ جائیں گے، وہ آخر وہاں کس سے پڑھیں گے؟ انگریز حاکم کی منطق نے اب بھی ہار نہیں مانی اُس نے کہا کہ آپ اُن سب طالبانِ علوم نبوت کو بریلی بلوالیں، میں ان کا معقول وظیفہ (اسکالرشپ) مقرر کر دوں گا وہ یہاں رہ کر آپ سے اپنی تعلیم جاری رکھیں اور اس کی تکمیل کریں تو مولانا نے اپنی کمان کا آخری تیر چھوڑتے ہوئے فرمایا ایک بات اور ہے ”جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال فرمائے گا کہ اے عبدالرحیم! رامپور میں تمہارے علم سے بہت سے غریب طلبہ ۱۰ور مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا تھا تم نے

ان کو چھوڑ کر دنیوی منفعت کی خاطر انگریز حاکم کی بات مان لی اور اس کے ملازم بن کر بریلی چلے گئے تو میں اس کو کیا جواب دوں گا؟"۔ انگریز حاکم سمجھ گیا کہ یہ ہمارے فریب میں نہیں آسکتے، ہندوستان کو فتح کرنے والے انگریز مولانا کے ہاتھوں مفتوح ہو گئے ؎

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

یہ تھا اُن کا کردار ؎

تقریر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

درحقیقت اِس کو کہتے ہیں کردار کی صلابت، اس کو کہتے ہیں کردار کی پختگی۔

موحد چہ در پائے ریزی زرش
چہ شمشیرِ ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نہ باشد زکس
بریں ہست بنیادِ توحید وبس

توحید کس کو کہتے ہیں؟ کہ سر پر آرا رکھا ہوا ور قدموں میں دولت کے ڈھیر ہوں، سونے اور چاندی کے سکّے پڑے ہوں، نہ آرے کا خوف دل میں پیدا ہو اور نہ طمع کی نظر درہم و دینار پر پڑے، یہ ہے توحید، اس کو کہتے ہیں کردار۔

حجاج بن یوسف ثقفی کا غرور اور حضرت حسن بصریؒ کی بیباکی

عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں جب حجاج بن یوسف ثقفی عراق کا گورنر بنا اور اس نے اپنے اختیارات کے استعمال میں حد سے تجاوز کیا تو حضرت حسن بصریؒ اُن چند رجالِ عظیم میں سے تھے جنھوں نے اس کے منہ زور اور سرکش اقتدار کو لگام دی، برسرِ عام اس کی سیاہ کاریوں اور مظالم کو ہدفِ تنقید بنایا اور اس کے منہ پر کلمۂ حق کہنے سے باز نہ آئے، آپ اُن کا کردار ملاحظہ فرمائیے:

حجاج نے بصرہ اور کوفہ کے درمیان شہر واسط میں اپنے لئے ایک محل تعمیر کروایا، جب اس کی تعمیر مکمل ہو چکی تو اس نے مُنادی کرادی کہ لوگ سیر وتفریح کے لئے اس کا محل دیکھنے آئیں اور اس

کے لئے خیر و برکت کی دعا کریں۔

حضرت حسنؒ نے لوگوں کے اس اجتماعِ عام کو غنیمت سمجھا اور یہ پسند نہ کیا کہ اتنا اچھا موقع ہاتھ سے جاتا رہے، لہٰذا آپ نے فیصلہ کرلیا کہ اس موقع پر لوگوں کو نصیحت کریں گے، اُنہیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلے میں ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں گے، ان پر متاعِ دنیا کی ناپائیداری اور بے وقعتی واضح کر کے تلقین کریں گے کہ وہ دنیا کی زندگی پر ہی نہ ریجھے رہیں، انہیں بتائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اجر و ثواب ملنے والا ہے وہ دنیا کے مال و متاع سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جب آپ موقع پر پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کا جمِّ غفیر اس بلند و بالا اور شاندار محل کے چاروں طرف جمع ہے، سب لوگ عمارت کے حسن و جمال سے متاثر، اس کی وسعت و کشادگی سے متحیر، اس کی ظاہری آرائش و زیبائش سے مسحور اور اس کے فنّی شکوہ و جلال سے مبہوت ہو رہے ہیں ؂

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے ☆ زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے

آپ نے مجمع کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس کے درمیان کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگے، فرمایا:

دنیا کا خبیث ترین انسان

”دنیا کے خبیث ترین انسانوں میں سے خبیث ترین انسان نے جو عمارت تعمیر کی ہے وہ ہم نے دیکھ لی، لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ فرعون نے اس سے بھی زیادہ مضبوط عمارت بنائی تھی اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو اس دنیا میں ہی ہلاک کر دیا اور اس کی تعمیر کردہ عمارت کو بھی تباہ و برباد کر ڈالا، کاش! حجاج کو معلوم ہوتا کہ اہلِ آسمان اس سے نفرت کرتے ہیں اور اہلِ زمین نے اس کو دھوکہ دے رکھا ہے، یہ تقریر کیا تھی، الفاظ و خیالات کا ایک دریا تھا جو بے روک ٹوک بہتا چلا جا رہا تھا حتیٰ کہ سامعین میں سے کسی کو حجاج کے جذبۂ انتقام کے بھڑک اٹھنے کا اندیشہ ہوا اُس نے اٹھ کر حضرت حسنؒ سے کہا ”اے ابوسعید! بس کیجئے، بس! یہی کچھ کافی ہے“۔ حضرت حسنؒ نے فرمایا: ”لوگو! یقین جانو، اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم سے یہ عہد لیا ہوا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے دینِ حق کو کھل کر بیان کریں گے اور اس میں سے کوئی چیز بھی چھپا کر نہیں رکھیں گے، میں تو بس اسی عہد کو پورا کر رہا ہوں“۔ ؂

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

دوسرے دن حجاج اپنے دربار میں داخل ہوا تو مارے غصے کے پھٹا پڑ رہا تھا، اس نے حاضرین سے کہا: ”دور ہو جاؤ، کم بختو! خدا تمہیں برباد کرے، بصرہ کا ادنیٰ سا غلام اٹھتا ہے اور ہمارے بارے میں جو جی میں آتا ہے بکتا چلا جاتا ہے اور تم ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے، تم میں سے کوئی نہیں جو اُٹھ کر اس کی تردید کرے یا اس کا منھ بند کرے۔ بزدلو! خدا کی قسم! میں تمہیں ضرور اس کا خون پلا کر چھوڑوں گا“۔

اس کے بعد اس نے تلوار اور چمڑے کا فرش (جس پر مجرم کا سر قلم کیا جاتا ہے) لانے کا حکم دیا، حکم کی تعمیل میں دونوں چیزیں دربار میں حاضر کر دی گئیں، پھر جلاد کو بلایا، جلاد بھی سامنے آکر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے پولیس کے سپاہیوں کی طرف نگاہ اٹھائی اور حکم دیا کہ حسن بن یسارؒ کو دربار میں حاضر کرو۔

اِس حکم کی تعمیل کی گئی تھوڑی دیر بھی نہ گزری تھی کہ حضرت حسنؒ دربار میں لائے گئے ؎

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

سب کی نگاہیں ان پر مرکوز ہو گئیں، مارے خوف کے دل دَھک دَھک کر رہے تھے کہ نہ جانے کیا سانحہ پیش آجائے، حضرت حسنؒ کی نظر تلوار، چمڑے کے فرش اور جلاد پر پڑی تو صورتحال کو بھانپ گئے، آپ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی اور آپ سیدھے حجاج کے سامنے چلے گئے۔

ایک مردِ مؤمن کا جلال اور داعی الی اللہ کا وقار

آپ کے چہرے پر ایک مردِ مؤمن کا جلال، ایک مسلم حق گو کا سا رعب اور ایک داعی الی اللہ کا سا وقار تھا، حجاج نے جو نگاہ اٹھا کر آپ کی طرف دیکھا تو اس پر زبردست ہیبت طاری ہو گئی اور اس کا سارا غیظ و غضب کافور ہو گیا۔ غیر ارادی طور پر اس کے منھ سے نکلا: ”آیئے، ابوسعید! آیئے، یہاں تشریف رکھئے“۔ یہ کہتے ہوئے وہ سمٹ کر آپ کے لئے جگہ بناتا جا رہا تھا۔

حاضرین حیرت واستعجاب کے عالم میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے حتیٰ کہ حجاج نے آپ کو اپنے قریب قالین پر بٹھالیا، جب حضرت حسنؒ اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے تو حجاج نے آپ سے کچھ

دینی مسائل پوچھنے شروع کر دیئے۔

حضرت حسنؒ اپنے وسیع علم کی بدولت بڑی دلجمعی کے ساتھ جادو اثر انداز میں ہر سوال کا جواب دیتے جا رہے تھے، حجاج کہتا جا رہا تھا ”بیشک اے ابوسعید! آپ تو سید العلماء ہیں“۔ اس کے بعد نہایت اعلیٰ درجہ کا عطر منگوایا اور آپ کی داڑھی کو لگا کر نہایت عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا۔ جب حضرت حسنؒ اس کے دربار سے باہر تشریف لائے تو حجاج کے دربان نے لپک کر آپ سے عرض کیا: ”اے ابوسعید! حجاج نے آپ سے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے، اس نے آپ کو اِس سے بالکل مختلف مقصد کے لئے بلایا تھا جب آپ آگے بڑھ رہے تھے تو میں آپ کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا، آپ کی نظر تلوار اور چمڑے کے فرش پر پڑی تو آپ کے ہونٹوں پر کچھ حرکت ہوئی تھی۔ اُس وقت آپ نے کیا کہا تھا“؟۔

دشمن کے شر سے حفاظت کی دعا

حضرت حسنؒ نے فرمایا، میں نے یہ دعا کی تھی: "یَا وَلِیَّ نِعْمَتِیْ وَمَلَاذِیْ عِنْدَ کُرْبَتِیْ إِجْعَلْ نِقْمَتَہٗ بَرْداً وَّسَلَاماً عَلَیَّ کَمَا جَعَلْتَ النَّارَ بَرْداً وَّسَلَاماً عَلیٰ إِبْرَاهِیْمَ" ”اے میرے ولی نعمت! اور اے میرے کارساز حقیقی! مصیبت میں میری جائے پناہ! حجاج کے جذبۂ انتقام کو مجھ پر اس طرح ٹھنڈا اور باعثِ سلامتی بنا دے، جس طرح تُو نے اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ پر آگ کو ٹھنڈا اور باعثِ سلامتی بنایا تھا“۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُس کے غصے کو محبت میں تبدیل کر دیا ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

یہ تھا اُن کا ایک عظیم کردار۔

حاکمِ عراق عُمر بن ہُبیرہ کا حضرت حسن بصریؒ اور امام شعبیؒ سے مکالمہ

یزید بن عبدالملک کا زمانہ ہے، یزید بن عبدالملک اموی بادشاہ تھا، اُس نے عمر بن ھُبیرہ کو عراق کا حاکم مقرر کیا، اُس کے بعد خوش ہوا تو اُس نے خراسان کا علاقہ بھی دے دیا، تو امیرِ عراق اور

امیرِ خراسان عمر بن ہُبیرہ نے اپنے زمانے کے دو بڑے عالموں کو بلایا، حسن بصریؒ کو اور امام شعبیؒ کو اور اُن سے مشورہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے امیر المؤمنین کی اطاعت کو ہم پر فرض کیا ہے، من أطاع الأمير فقد أطاعني ومن عصىٰ الأمير فقد عصاني. مگر بعض اوقات امیر المؤمنین کے ایسے احکام ہمارے پاس آتے ہیں کہ اُن کے مبنی بر عدل ہونے کے بارے میں خود مجھے بھی اطمینان نہیں، لیکن اُن کا نافذ کرنا ضروری ہے، اس لئے کہ امیر المؤمنین کا حکم ہے تو دین اسلام میں اس سے بچنے کی بھی سبیل ہے؟ دیکھئے! یہ ہے امتحان کا موقع، اتنا بڑا اصحابِ منصب گنجائش پوچھ رہا ہے، صحیح مسئلہ ایک غریب آدمی کو بتا دینا آسان ہے لیکن ایک صاحبِ اقتدار کے سامنے حق کہنا أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر یہ بڑا جہاد ہے، یہ ہے کردار، تو امام شعبیؒ نے کچھ ایسا جواب دیا جس میں خلیفہ کے حق میں نرمی اختیار کرنے اور اس کے ساتھ نباہ کرنے کی بات تھی، حضرت حسن بصریؒ خاموش رہے، فالتفت بن هبيرة إلى الحسن البصري. تو ابن ہبیرہ نے حسن بصریؒ کی طرف منھ کیا اور کہا: أنت ماتقول يا أبا سعيد. آپ کیا فرماتے ہیں؟ تو اللہ کے شیر نے زبان کھولی! يا ابن هبيرة خفِ الله في يزيد ولا تخف يزيد في الله. اب مجھ سے کہلوانا ہی چاہتے ہو تو سنو اے ابن ہبیرہ یزید کے احکام کے بارے میں اللہ سے ڈرو اور اللہ کے بارے میں یزید سے نہ ڈرو، واعلم أن الله يمنعك من يزيد وان يزيد لا يمنعك من الله. اور یہ بات دل میں راسخ کرلو کہ اللہ یزید سے تم کو بچا سکتا ہے لیکن یزید تم کو اللہ سے نہیں بچا سکتا۔ واعلم يا ابن هبيرة اور یہ بھی سن لو إنه يوشك أن ينزل بك غليظ شديد لايعصى الله ما أمره فيزيلك عن سريرك هذا وينقلك من سعة قصرك إلى ضيق قبرك حيث لاتجد هناك يزيد، وإنما تجد عملك الذى خالفت فيه رب يزيد۔ ؎

اگر بمُرد عدو جائے شادمانی نیست
کہ زندگانی ما نیز جاودانی نیست

دشمن کی موت پر خوش نہ ہونا چاہئے

اگر دشمن مر گیا تو خوشی کا کیا موقع ہے؟ کیا ہمیں ہمیشہ رہنا ہے ہمیں بھی تو جانا ہے، تو فرمایا کہ اے

ابن ہبیرہ! وہ دن یاد رکھو جب اللہ کا سخت مزاج اور تُند خو فرشتہ آئے گا جو سوائے اللہ کے کسی کی نہیں سنے گا، اور تم کو تمہاری کرسی سے اتار کر اور اس محل کی وسعت سے نکال کر قبر کی تنگی میں داخل کردے گا تم وہاں یزید کو نہ دیکھوگے، البتہ اپنا وہ عمل ضرور دیکھوگے جو اس دنیا میں تمہارے ہاتھوں ہوا ؎

پوچھیں گے تم لائے کیا اعمال ہو
یہ نہ پوچھیں گے کہ کس کے لال ہو

یـا ابـن هبيـرة إنك إن تك مع الله تعالىٰ وفي طاعته يكفك بائقة يزيد ابن عبـد الـملك فـي الدنيا والآخرة وإن تك مع يزيد في معصية الله تعالىٰ فإن الله يكلك إلى يزيد۔ اے ابن ہبیرہ! یاد رکھو کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں زندگی بسر کی تو وہ دنیا وآخرت میں یزید بن عبدالملک کے شر سے تم کو محفوظ رکھے گا لیکن اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے میں یزید کا ساتھ دیا تو اللہ تعالیٰ تم کو یزید ہی کے حوالے کردے گا اور تم بھی اُسی انجام سے دوچار ہوگے جس سے وہ دوچار ہونے والا ہے۔ اُس کے بعد فرمایا! واعـلـم يا بن هبيـرة أنـه لاطـاعة لمخلوق كائناً من كان في معصية الخالق عزّوجل۔ یہ بات اصولی طور پر سمجھ لو کہ اگر خالق کی معصیت ہو تو چاہے جتنی بڑی شخصیت ہو اُس کی اطاعت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ عمر بن ہبیرہ ہمہ تن گوش ہو کر حضرت حسنؒ کی یہ پُر اثر تقریر سن رہا تھا، اور اس کی اشکبار آنکھوں سے اس کی داڑھی تر ہورہی تھی اور چہرے پر زردی بکھر گئی تھی۔ فالتفت بن هبيـرة إلى الحسن البـصـري ومـال عن الشعبي وبالغ في إعظامه وإكرامه۔ اب اُس نے اپنا رخ حضرت شعبیؒ سے ہٹا کر حضرت حسنؒ کی طرف کرلیا اور ان کی تعظیم وتکریم میں انتہا کردی، اور اُس کے بعد یہ دونوں حضرات گورنر کے دربار سے اٹھ کر جامع مسجد نماز پڑھنے کے لئے گئے تو لوگ وہاں اکٹھے ہوگئے چونکہ امیر عراق نے بلایا تھا تو پوچھنے لگے بھائی کیا گذری؟ تو امام شعبیؒ نے جواب دیا یـا أيهـا الـنـاس من استطاع منكم أن يؤثر الله عزوجل على خلقه في كل مقام فليفعل! امام شعبیؒ نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا، لوگو! جو شخص کسی معاملے میں اللہ تعالیٰ کو ساری مخلوق پر

ترجیح دے سکتا ہو اُسکو ضرور ایسا کرنا چاہئے، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، حسنؒ نے عمر بن ہبیرہ سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے میں ناواقف ہوں، لیکن سچ یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کہا، اُس میں میرے پیشِ نظر ابن ہبیرہ کی دلجوئی تھی اور حسنؒ نے جو کچھ کہا، اس میں خدا کی خوشنودی مدِّنظر تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ابن ہبیرہ کو مجھ سے دور کردیا اور میری وقعت اس کی نظر میں گرگئی لیکن حسنؒ کو اسکے قریب کردیا اور اس کے دل میں اُن کی محبت ڈال دی۔ ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ☆ ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

تو عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ اس کو کہتے ہیں کردار کی صلابت، کردار کی پختگی کہ عدل وانصاف سے کام لینے کا موقع ہو اُس وقت قدم نہ ڈگمگائے۔

قرآن کریم میں ہے: یأ أیها الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شهداء لله ولو علیٰ أنفسکم أو الوالدین والأقربین. اے ایمان والو! تم انصاف کے علمبردار بنو اور حق کی شہادت دینے والے بنو، چاہے یہ شہادت رشتے داروں کے خلاف پڑے، چاہے والدین کے خلاف پڑے، اور چاہے اپنی اولاد کے خلاف پڑے۔

حضرت عمرؓ اور ایک اعرابی کا تنازعہ اور قاضی شریحؒ کا جرأتمندانہ فیصلہ

دیکھئے کردار کی صلابت! امیر المؤمنین حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے مقرر کئے ہوئے تھے قاضی شریحؒ، اُن کو قاضی کس نے بنایا؟ اول تو بنایا تھا حضرت عمر بن خطابؓ نے اُس کے بعد یزید بن معاویہؓ کے زمانے تک حضرت شریح بن حارث ہی ساٹھ سال تک قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) رہے، تاریخ میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جو ساٹھ سال تک قاضی القضاۃ رہا ہو، حضرت عمرؓ نے ایک دیہاتی سے گھوڑا خریدا اور کچھ دور گئے اور لوٹ آئے اور کہا کہ اپنا گھوڑا واپس لو، اس میں عیب ہے تو اُس نے کہا کہ حضرت! جب میں نے آپ کو گھوڑا دیا تھا تو تندرست تھا، صحیح سالم تھا، اب اُس کا پیر خراب کرکے لائے ہیں واپس کرنے کے لئے تو حضرت نے فرمایا اجعل بینی وبینك حكماً۔ چلو کسی سے فیصلہ کرواؤ تو اُس نے کہا یحکم بیننا شریح بن الحارث. حضرت شریحؒ ہمارے

اور آپ کے درمیان فیصلہ کریں گے، تو اُن کے سامنے مسئلہ پہنچا، امیر المؤمنین کے خلاف دعویٰ ہے یہاں پر ہے مضبوطی کا امتحان، یوں آپ ایک جھونپڑی میں رہنے والے کے خلاف فیصلہ دے دیں یہ بہت آسان کام ہے، لیکن اپنے ایک افسر جس کے ماتحت آپ ہیں اور جس کی ایک جنبشِ نظر میں آپ کا عہدہ ختم ہو سکتا ہے اُس کے خلاف فیصلہ دینا، یہ ہے کردار کی مضبوطی، اس کو کہتے ہیں کردار کی صلابت، تو حضرت عمرؓ کا مسئلہ پیش ہوا، اُس دیہاتی نے کہا میں نے ان کو گھوڑا دیا، یہ کچھ دور گئے اُس کے بعد کہتے ہیں کہ گھوڑا تمہارا عیب دار ہے تو حضرت شریحؒ نے پوچھا هل أخذت الفرس صحيحاً يا أمير المؤمنين؟ امیر المؤمنین جس وقت آپ نے گھوڑا لیا تھا اُس وقت وہ لنگڑاتا تھا؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں تو حضرت شریحؒ نے کیا جواب دیا؟ إحتفظ بما اشتريت يا أمير المؤمنين أو رُدَّ كما أخذتَ۔ امیر المؤمنین! اگر یہ بات ہے تو یا تو آپ نے جو کچھ خرید لیا ہے اُسے سنبھال لیں ورنہ اُسی حالت میں واپس لوٹائیں جس حالت میں لیا تھا، حضرت عمرؓ نے تعجب سے حضرت شریحؒ کی طرف دیکھا اور کہا کیا آپ کے نزدیک یہی انصاف ہے؟ حضرت شریحؒ بولے ''بیشک یہ حکم قطعی اور انصاف پر مبنی ہے''۔ حضرت عمرؓ اُن کے دو ٹوک فیصلے سے سمجھ گئے کہ اُن کے اندر جوہرِ قابل موجود ہے اور اُن کو ضرورت تھی ایک قاضی کی تو فرمایا جاؤ میں نے تم کو کوفے کا قاضی مقرر کیا۔ یہی واقعہ ہے اُن کے قاضی ہونے کا۔

حضرت علیؓ اور ایک یہودی کا محاکمہ قاضی شریحؒ کی عدالت میں

پھر حضرت علیؓ کا واقعہ پیش آیا اُنہیں کی خلافت کے زمانے میں کہ ایک یہودی زرہ بیچ رہا تھا، حضرت نے پکڑ لیا کہ یہ تو میری زرہ ہے اور رات میں جاتے ہوئے گر پڑی تھی اور تو نے اٹھا لی تو اُس یہودی نے کہا کہ بل هي درعي وفي يدي. یہ میری زرہ ہے اور دلیل اُس کی یہ ہے کہ یہ میرے قبضے میں ہے، بولے یہ کوئی بات نہیں ہوئی، کہا آپ نہیں مانتے ہیں تو چلئے قاضی کے یہاں فیصلہ کرالیں، کتنا اطمینان تھا کہ قاضی صحیح فیصلہ کرے گا، جا کر اُس نے معاملہ پیش کیا کہ امیر المؤمنین فرماتے ہیں کہ یہ میری زرہ ہے حالانکہ میرے قبضے میں ہے اور یہ میری ہے، اب دیکھئے یہ کتنا بڑا

امتحان تھا، حضرت علیؓ اُس وقت امیر المؤمنین تھے اور قاضی شریح بن حارثؒ اُن کے ماتحت تھے اگر چاہتے تو اُن کو ہٹا دیتے اور دوسرے کو قاضی مقرر کر دیتے، خلیفہ کو اختیار رہتا ہے، قاضی شریحؒ نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں اے امیر المؤمنین آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں لیکن ذاتی علم پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، اصول اور قانون پر عمل کرنا ضروری ہے۔ آپ کے پاس دو گواہ ہیں؟ جو یہ گواہی دیں کہ یہ زرہ آپ کی ہے تو حضرت علیؓ نے فرمایا نعم ولدی الحسن ومولای قنبر یشهدان لی۔ میرا لڑکا حسن اور میرا غلام قنبر گواہی دیں گے کہ یہ زرہ میری ہے۔

غلام کی گواہی آقا اور بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں ہے

تو قاضی شریحؒ نے فرمایا کہ غلام کی گواہی آقا کے لئے اور بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں ہے، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ بولے۔ یا سبحان الله رجل من أهل الجنة لاتجوز شهادته۔ سبحان اللہ! ایک وہ آدمی کہ رسول علیہ السلام نے جس کی زندگی میں جنتی ہونے کی بشارت دی اُس کی گواہی آپ نہیں قبول کریں گے؟ أما سمعت قول رسول الله ﷺ آپ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان نہیں سنا؟ کہ الحسن والحسين سيدا شباب أهل الجنة۔ حسن اور حسین جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں، قاضی شریحؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث سر آنکھوں پر۔ لیکن یہ آخرت کے بارے میں ہے، دنیا میں تو قانونِ عدل وانصاف پر عمل کرنا ضروری ہے تو حضرت علیؓ نے فرمایا! ليس عندي شاهد غيرهما۔ میرے پاس تو اِن دونوں کے علاوہ اور کوئی گواہ نہیں ہے اور اُس یہودی سے کہا خذ الدرع۔ کہ زرہ لے لو، زرہ اُس کو دے دی لیکن اُس کے دل پر قبضہ کر لیا ؎

ایمان وعمل کی دنیا میں اِس طرح گذارا کرتے ہیں
اخلاق سے جیتا کرتے ہیں احسان سے مارا کرتے ہیں

حضرت علیؓ کے کردار سے متأثر ہو کر یہودی کا قبولِ اسلام

تلوار کا مارا ہوا تو اچھا ہو سکتا ہے لیکن اخلاق کا مارا ہوا کبھی اچھا نہیں ہو سکتا، یہ اخلاق کی مار ہے کہ جس کا گھاؤ بھرتا نہیں، اُسی وقت اُس یہودی نے کہا: ولكني أشهد بأن الدرعَ لك يا

امیر المؤمنین۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ زرہ اے امیر المؤمنین آپ کی ہے اور پھر کہنے لگا۔ یا اللّٰہِ أمیر المؤمنین یقاضینی أمام قاضیه وقاضیه یقضی لی علیه۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ امیر المؤمنین اپنا مقدمہ اپنے ہی قاضی کے سامنے رکھتے ہیں اور اُن کا قاضی اتنا بیباک، اتنا دلیر، اتنا حق پرست اور عدل کا اتنا علمبردار ہے کہ اُن کے معاملے میں اُن کے خلاف اور مجھ جیسے کافر کے حق میں فیصلہ دیتا ہے۔ أشهد أن الدین الذی یأمر بهذا لَحَقٌّ۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ جو دین اتنی جرأت، اتنی جسارت، اتنی بیباکی اور اتنی صداقت سکھاتا ہے وہ جھوٹا دین نہیں ہوسکتا بلکہ وہ سچا دین ہے۔ اے امیر المؤمنین اپنا ہاتھ لائیے، میں آپ کے ہاتھ پر ایمان کی بیعت کرتا ہوں۔ أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمداً عبده ورسوله تو حضرت علیؓ نے فرمایا! أما وانك قد أسلمتَ۔ فقد وهبت الدرع لك ووهبت لك معها هذا الفرَسَ أیضاً۔ اچھا! اب تم ایمان لے آئے ہو تو یہ زرہ میں نے تمہیں بطور عطیہ بخش دی اور اُس کے ساتھ ایک گھوڑا بھی میں نے تم کو بخش دیا۔

امامت اور پیشوائی بغیر کردار کے امتحان کے نہیں مل سکتی۔

تو میرے بھائیو! یہ ہے کردار۔ وإذ ابتلی ابراهیم ربه بکلمٰت فأتمهن قال إنی جاعلك للناس إماماً۔ امامت اور پیشوائی بغیر کردار کا امتحان لئے نہیں مل سکتی، حضرت ابراہیمؑ نے کردار کی پختگی کا امتحان دیا، وطن سے ہجرت کرنا، یہ کتنے بڑے کردار کی بات ہے، آگ کے الاؤ میں حق کے لئے کود جانا یہ کتنے بڑے کردار کی بات ہے۔ بیٹے کی قربانی کے لئے تیار ہوجانا یہ کتنے بڑے کردار کی بات ہے، جب اِن مشکل امتحانات میں وہ پورے اترے تو خدا نے فرمایا ہم نے تمہارے لئے دنیا میں امامت اور پیشوائی رکھی ہے، رہتی دنیا تک عظمت واحترام کے ساتھ تمہارا نام لیا جائے گا۔ اللہ ہمیں کردار کی پختگی عطا فرمائے۔ (آمین)

❀❀❀

چار زندگیاں
قرآنِ کریم کے آئینے میں

از: مولانا مفتی شکیل احمد قاسمی سیتاپوریؒ

درج ذیل خطاب مکتبہ اسلامیہ شارجہ میں ۷؍اکتوبر ۱۹۹۸ء کو ہوا جس میں مقیم ہندوستانی علمائے کرام اور عام مسلمانوں کے علاوہ بطور خاص عصری تعلیم یافتہ طبقے کی ایک قابل ذکر تعداد شریک تھی۔ (مدیر)

محترم حضرات! قرآن کریم نے مختلف زندگیوں کا نقشہ کھینچا ہے اور ایک آئینہ رکھ دیا ہے کہ اُس آئینے میں اپنی شکل آدمی دیکھ سکتا ہے، ایک زندگی کافرانہ زندگی ہے، اور ایک زندگی نفس پرستانہ زندگی ہے اور ایک زندگی منافقانہ زندگی ہے، اور ایک زندگی مؤمنانہ زندگی ہے۔ قرآنِ کریم نے چاروں زندگیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔

(۱) کافرانہ زندگی

کافرانہ زندگی! لااُبالی، بے پروائی، جسارت، دلیری اور غفلت کی زندگی ہے ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ﴾ (سورۂ محمد:۱۲) جو اللہ کے منکر ہیں وہ چوپایوں کی طرح کھاتے ہیں، بھینس کے سامنے چارہ ڈال دیا گیا اُسے اِس کی کوئی پروا نہیں کہ چارہ کہاں سے آرہا ہے؟ حرام طریقے سے آرہا ہے یا حلال طریقے سے آرہا ہے اور اس چارے کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور اُس کے کچھ احکامات ہیں یا نہیں ہیں ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور جس طرح بیل اور بھینسے کھاتے ہیں، اسی طرح کافر ستر سال اور اسّی سال کی زندگی غفلت، بے شعوری، بے تمیزی اور بے پروائی کے ساتھ گذار کر چلا جاتا ہے، اسی کو قرآنِ کریم نے فرمایا﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ﴾ وہ لوگ جو اللہ کے منکر ہیں وہ لطف اٹھاتے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جیسے چوپائے کھاتے ہیں، جو ستر سال کی زندگی اور اسّی سال کی زندگی اس نیلی چھت کے نیچے اور اس روئے زمین کے اوپر اور اِن دریاؤں کے بیچ میں اور اِس دہکتے ہوئے سورج اور چمکتے ہوئے چاند اور جھلملاتے ہوئے ستاروں اور چہکتے ہوئے پرندوں اور لہلہاتے ہوئے باغات، اِن کے درمیان میں رہ کر غفلت کے ساتھ زندگی گذار دیں۔

وفـــی کـــل شـــئ لـــــه آیة
تـــدل عـــلـــی أنـــــه واحـــد

ہر چیز پکار رہی ہے کہ خدا ایک ہے

برگِ درختانِ سبز درنظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

ہر مخلوق اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ایک دفتر لئے ہوئے ہے

نیم کی ایک پتی بھی اللہ کی معرفت کا ایک دفتر لئے ہوئے ہے، اُس پتی کو دیکھئے کہ کیسا اُس کا کٹاؤ ہے اور کیسے اُس کے ریشے ہیں اور کیسی اُس کے اندر ملاحت اور لطافت ہے، کوئی ایسا نقاش ہے جو ایسا نقش بنا سکے؟ ﴿أَفَرَأَيْتُم مَا تُمْنُوْنَ ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ﴾ (سورۂ واقعہ:۹) نظامِ تولید پر کبھی آپ نے غور کیا؟ پانی کی بوند سے ایک آدمی بنا کر کھڑا کردینا یہ آپ کا کام ہے یا ہمارا کام ہے؟ جب کوئی کام انجام پذیر نہیں ہوتا تو کہا جاتا ہے کہ یہ کام نقش برآب ہے یعنی پانی پر لکیر کھینچنے کے مانند ہے، جیسے پانی پر لکیر کھینچنا ایک لاحاصل کام ہوتا ہے، پانی پر نقشہ نہیں بنایا جاسکتا، لیکن اللہ تعالیٰ پانی ہی پر نقشہ بناتا ہے اور وہ نقشہ ستر سال اور اسی سال رہتا ہے اور حیرت انگیز کارنامے انجام دیتا ہے۔

دہد نطفہ را صورتے چوں پری
کہ کرد است بر آب صورت گری

کہ ایک پانی کی بوند پر اللہ نقش بناتا ہے یہ نقش بنانا کس کا کام ہے؟ ﴿أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ﴾ (سورۂ واقعہ:۶۴) یہ جو پودے نکلتے ہیں آپ ہیں اِس کے نکالنے والے یا ہم ہیں نکالنے والے، مخمل سے زیادہ نازک ونرم انکھوا پودے کا نکلتا ہے تو پتھر جیسی زمین کو چیر کر نکلتا ہے، یہ اللہ کا کام نہیں تو اور کس کا کام ہے؟ ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھردی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

تو ایک ایک چیز پکار پکار کر اللہ کی وحدانیت کو بتلا رہی ہو اور ستر سال اور اسّی سال اس ماحول میں رہے اور آنکھ نہ کھلے ایسے آدمی کو اگر جہنم کے الاؤ میں ڈال دیا جائے تو یہ ناانصافی ہے؟ نہیں، عین عدل وانصاف ہے، یہ کافرانہ زندگی ہے۔ ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ﴾ جو اللہ کے منکر ہیں وہ موج ومستی کر رہے ہیں اور اس طرح غفلت سے کھا رہے ہیں جیسے چوپائے کھاتے ہیں اور اُن کی پیدائش کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے، جیسے کھیل کے طور پر اُن کو پیدا کر دیا گیا ہے، ایسے لوگوں کے لئے دوزخ ٹھکانہ ہے۔

(۲) نفس پرستانہ زندگی

اور ایک ہے نفس پرستانہ زندگی! ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ﴾ (سورۂ آل عمران:۱۴) شیطان نے

ہمارے دلوں میں کچھ تصویریں خوبصورت کر کے پیش کردی ہیں مثلاً بیوی کی محبت، اُس کی تصویر نہایت خوشنما ہمارے ذہن میں رکھ دی ہے، دن رات ہمارا وظیفہ حیات ہے کہ یہ خوبصورت چہرہ خوش ہوجائے، حاصلِ زندگی آپ کا یہ ہے کہ بیٹے کا مستقبل بن جائے، چاہے کسی یتیم کی پیٹھ پر چڑھ کر ہو، بیویوں کی محبت دلوں میں ڈال دی گئی ہے، اولاد کا عشق دلوں میں ڈال دیا گیا ہے، آنکھ کھلتی ہے تو بھینس پر کھلتی ہے کہ بھینس کو نہلا رہا ہے، اُس کے گوبر کو ڈھورہا ہے، آنکھ کھلتی ہے تو تجوری میں کھلتی ہے، آنکھ کھلتی ہے تو کھیت میں کھلتی ہے، کھیتوں کی محبت، گھوڑوں کی محبت، سونے وچاندی کی محبت، یہ ہے نفس پرستانہ زندگی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِس کی اہمیت سے انکار نہیں ہے لیکن ﴿ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ یہ ناپائیدار سامان ہیں، یہ پائیدار نہیں ہیں، ﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ﴾ اور اللہ کے پاس پائیدار چیزیں ہیں، یہ ہے نفس پرستانہ زندگی۔

(۳) منافقانہ زندگی

اور ایک ہے منافقانہ زندگی! ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ، وَإِذَا تَوَلّٰى سَعىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ، وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ (سورۂ بقرہ: ۲۰۴-۲۰۶)

کہ کچھ لوگ ہیں جو شہد سے زیادہ میٹھی باتیں کرتے ہیں اور بات بات پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں، امام بیضاویؒ بہت بڑے مفسر ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہر بات پر منافق کہتے ہیں کہ خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں آپ کا کتنا درد ہے اور اللہ گواہ ہے کہ میں نے آپ لوگوں کے لئے کتنا کام کیا ہے، اللہ کو گواہ اس لئے بناتے ہیں کہ انسانوں میں تو کوئی گواہ ہے ہی نہیں کہ جب اس نے کوئی کام ہی نہیں کیا تو انسانوں میں گواہی کون دے گا؟ اس لئے بات بات پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں، حالانکہ زبان اُن کی شہد سے زیادہ میٹھی اور دل ان کا زہر سے زیادہ خطرناک ہے اور بھیڑیے سے زیادہ خونخوار، محفل میں رہتے ہیں تو بناؤ کی باتیں کرتے ہیں اور جہاں محفل سے اٹھتے ہیں تو ریشہ دوانیاں اور دسیسہ کاریاں اُن کا کام ہے، اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ہے، چنانچہ منافق کی موت کبھی اچھی نہیں ہوتی، ہمیشہ منافق

بُری موت اور کس مپرسی کے عالم میں مرتا ہے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

ارشادِ نبوی ہے: "مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَمَثَلِ الشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ تَعِيرُ إِلىٰ هٰذِهِ مَرَّةً وَإِلىٰ هٰذِهِ مَرَّةً" (صحیح مسلم)

منافق کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بکری کو نَر کی تلاش ہو، جو کبھی اِس ریوڑ کی طرف جاتی ہے نَر کی تلاش میں اور کبھی اُس ریوڑ کی طرف نر کی تلاش میں، اُس کو یہ بھی شرم نہیں کہ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے پورے ریوڑ کے سامنے اپنے آپ کو رسوا کر رہی ہے کہ میری خواہش کی تسکین ہو جائے چاہے اِس ریوڑ سے ہو جائے چاہے اُس ریوڑ سے، یہ ایک بے غیرتی اور نفس پرستی کا مظاہرہ ہے یہ ہے منافقانہ زندگی۔

(۴) مؤمنانہ زندگی

اور ایک ہے مؤمنانہ زندگی! ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوْا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْداً عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلىٰ النَّاسِ وَأَقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ وَآتُوْا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلىٰ وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ (سورۂ حج: ۷۷-۷۸)

اے اہلِ ایمان اللہ کی بارگاہ میں جھکو اور اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاؤ اور اللہ کے راستے میں کوشش کا جو حق ہے وہ ادا کرو، جہاد کے معنیٰ ہیں ممکنہ کوششوں کو صرف کر دینا، آپ کو چُنا گیا ہے آپ کی ذمہ داری ہے، ممکنہ کوششیں کیا ہیں؟ کہ مال کی ضرورت ہے تو مال لے لیجئے یہاں تک کہ اگر جان کی ضرورت ہے تو جان بھی حاضر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر جان بھی دے دی جائے تو بھی حق نہیں ادا ہوا، اس لئے کہ اللہ نے جو جان ہم کو بخشی تھی وہ معصوم اور بے گناہ جان تھی ؎

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

ہماری مثال ایسی ہے جیسے شمع: کہ روتے ہوئے آئے اس کے بعد جب بجھے تو تمام آنسو ہمارے دامن کے اوپر لگے ہوئے تھے۔

معصوم روح خدا نے ہم کو عطا کی تھی اور ہم نے اُسے گناہوں سے آلودہ کر کے خدا کے حوالے کیا ہے، اگر حوالے بھی کیا تو جیسی امانت تھی ویسے حوالے بھی نہیں کیا، کسی شاعر نے جو کہا ہے وہ بالکل صحیح کہا ہے ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اگر بے گناہ جان دیتے اور غیر ملوث جان دیتے تو یہ حق ادا ہوتا، کہاں حق ادا ہوا؟ جیسی امانت تھی ویسی نہیں لوٹائی بلکہ گنہ گار اور آلودۂ عصیاں جان کو ہم نے خدا کی بارگاہ میں پیش کیا، چُنی ہوئی قوم کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

جو لوگ مقرب ہوتے ہیں ان کے لئے دشواریاں زیادہ ہوتی ہیں اور یہ بات یاد رکھئے کہ توریت، انجیل، زبور اور دنیا کی تمام مذہبی کتابیں تحریف کا شکار کیوں ہوئیں؟ اور قرآن تحریف سے کیوں محفوظ رہا؟ یہ فخر کرنے کی چیز ہے۔

قرآن آج تک زندہ ہے، کیونکہ اس کی زبان زندہ ہے

میں ایک بات عرض کیا کرتا ہوں کہ دنیا کی جتنی بھی مذہبی کتابیں تھیں سب مر چکیں، اس لئے کہ ان کی زبان مرگئی، وید کے بارے میں ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ یہ مذہبی کتاب ہے، اور وہ سنسکرت میں ہے، کاشی متھرا میں بھی اور اجودھیا میں بھی سنسکرت کی زبان میں گفتگو نہیں ہوتی، نہ وہاں قانون سنسکرت کی زبان میں لکھا جاتا ہے، نہ کسی محلے میں، نہ بازار میں، نہ کسی دکان پر دکاندار اور گاہک سنسکرت میں بات کرتے ہیں، ہندوستان کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہے اور نہ نیپال کا کوئی ایسا ٹکڑا ہے کہ اس میں سنسکرت بولی جاتی ہو اور وہاں رجسٹر سنسکرت میں تیار کیا جاتا ہو، یا وہ بازار کی

زبان ہو، اسی طرح دنیا کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں جہاں عبرانی اور سُریانی زبان بولی جاتی ہو، اور قرآن کی زبان عربی تھی، اللہ کا شکر ہے کہ درجنوں ملک ایسے ہیں جہاں کی دستوری اور سرکاری زبان عربی ہے، کتابیں زندہ ہوتی ہیں اپنی زبان سے، تمام کتابیں مرچکی ہیں اس لئے کہ اُن کی زبان مرچکی اور قرآن زندہ ہے اس لئے کہ اُس کی زبان زندہ ہے ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمت او لایزال ست وقدیم

قرآن کریم پر ہمیشہ خلافت اور حکومت کا پہرہ رہا ہے

میں یہ عرض کررہا تھا کہ یہ چیز غور کرنے کے لائق ہے کہ توریت وانجیل میں کیوں تحریف ہوئی؟ اور ویدیں کیوں نہ بچ سکیں، جس کتاب کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ کس دور میں نازل ہوئی اور یہ معلوم نہیں کہ کس شخصیت پر نازل ہوئی، جس وید کے بارے میں ہندو دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ مذہبی کتاب ہے وہ اتنی تاریکیوں میں ہے کہ آپ کو ہنسی آئے گی، یعنی آج تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ یہ چار ہزار سال پہلے نازل ہوئی یا چھ ہزار سال پہلے۔ کوئی کہتا ہے کہ چار ہزار سال پہلے اتری، کوئی کہتا ہے دس ہزار سال پہلے اتری، کوئی کہتا ہے فلاں شخصیت پر اتری، کوئی کہتا ہے فلاں شخصیت پر اتری، اور ماشاء اللہ قرآنِ کریم بالکل اجالے میں ہے کہ کونسی آیت رات میں اتری اور کونسی آیت دن میں اتری اور کونسی آیت مکے میں اتری، اور کونسی آیت مدینے میں اتری اور کونسی آیت گرمیوں میں اتری اور کونسی آیت سردیوں میں اتری، اور کونسی آیت کس جگہ پر اتری، صیفی آیتیں الگ ہیں، شتائی آیتیں الگ ہیں، لیلی آیتیں الگ ہیں، نہاری آیتیں الگ ہیں، مکی آیتیں الگ ہیں، مدنی آیتیں الگ ہیں، بالکل اجالا ہے، کھلی کتاب ہے، یہاں روشنی ہی روشنی ہے، اندھیرا نہیں ہے، لیکن ایک اور چیز ہے جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، اللہ کا فضل ہے کہ آپ صداقت پر ہیں، میں تو ہندوستان میں کہا کرتا ہوں کہ اگر چار آدمی ہیں اور وہ اجالے میں کھڑے ہیں اور چار ہزار اور چار لاکھ آدمی اندھیرے میں کھڑے ہیں تو کیا چار لاکھ کی وجہ سے اندھیرے کو اجالا کہا جائے گا؟ اور چار آدمیوں کی وجہ سے اُن کے نور کو ظلمت کہا جائے گا؟ حقائق اقلیت اور اکثریت سے تبدیل نہیں ہوا

کرتے، اقلیت اگر اجالے میں ہے تو اجالا اندھیرا نہیں بن سکتا اور اکثریت اگر ظلمت میں ہے تو اُس کو نور نہیں کہا جاسکتا، اگر اکثریت نے زہر کھانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اکثریت ہلاک ہوگی اور اگر اقلیت تریاق کو استعمال کر رہی ہے تو وہ نجات پائے گی اور انشاء اللہ اس کو حیات ملے گی، کہیں حقائق اقلیت اور اکثریت سے بدلا کرتے ہیں؟ یہ وہم کی چیزیں یہ دھوکے کی تدبیر ہے، یہ مکڑی کا جالا ہے، تو میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ آپ غور فرمائیں توریت وانجیل کے بارے میں کہ بخت نصر آیا اور اس نے توریت وانجیل کو جلا کر خاک کردیا اور تمام نسخے اس کے تبدیل کردیئے اور ویدوں میں تبدیلی ہوئی، قرآن تحریف سے کیوں محفوظ رہا؟ اس لئے محفوظ رہا کہ قرآن کے اوپر ہمیشہ تلوار کا سایا رہا، کوئی دور بھی قرآن کے نازل ہونے کے زمانے سے لے کر آج تک ایسا نہیں گزرا کہ تلوار کے سائے سے محفوظ نہ رہا ہو، ہمیشہ ایک خلافتِ راشدہ اور ایک حکومت کا پہرے دار اُس پر بیٹھا رہا کہ کسی کی مجال نہیں کہ اُس کو ترچھی نگاہ سے دیکھ لے، کوئی دور، قرآن جب سے نازل ہوا آج تک ایسا نہیں گذرا کہ حرمین شریف پر کسی کا ایسا تسلط ہوجائے جو قرآن میں دست بُرد کرے ؎

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

سلطان عبدالحمیدؒ کا یہودیوں اور عیسائیوں کو دوٹوک جواب

آپ کو معلوم ہے؟ کہ سب سے پہلے ترکی کے سلطان عبدالحمید سے انگریزوں اور یہودیوں نے مطالبہ کیا کہ ایک ٹکڑا ہم کو فلسطین میں دے دیا جائے، جس میں ہم لوگ اپنا ملک بناسکیں تو سلطان عبدالحمید نے فرمایا! کہ میں زمین کا مالک نہیں ہوں اگر چہ خلیفہ ہوں، مسلمان پوری سرزمین کے مالک ہیں اور زمین کا چپّہ چپّہ مسلمانوں کے شہیدوں کے خون سے رنگا ہوا ہے، زمین کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہے جہاں کوئی شہید مدفون نہ ہو، لہٰذا عبدالحمید کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ ایک بالشت ٹکڑا بھی کسی کو دے دے، جب انہوں نے یہ تیور دیکھے تو آپ کو معلوم ہے؟ اُس زمانے میں پچاس لاکھ پاؤنڈ کی پیشکش کی گئی تھی سلطان عبدالحمیدؒ کو یعنی اب سے سوڈیڑھ سو سال پہلے کہ آپ چھوٹا سا ٹکڑا دے دیجئے، تو سلطان نے دینے سے صاف انکار کردیا، اُسی وقت انگریزوں اور یہودیوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اِن کی خلافت کو برباد کرنا ہے، چنانچہ ان کے خلاف عربوں کو اکسایا، شریفِ مکہ کو خریدا اور عربوں میں عربی تعصب پیدا کیا اور کہا کہ تم ترکوں کی حکمرانی کے نیچے رہتے ہو؟ انہوں نے سوچا

کہ خلافت یہ پشتیبان ہے اسلام اور مسلمانوں کی، اس پشتیبان کو یہاں سے ہٹا دیا جائے، اس دیوار کو جو سہارا ہے اسلام کے لئے توڑ دیا جائے تاکہ اسلام کا سہارا باقی نہ رہ جائے، چنانچہ انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے خلافت کو ختم کر دیا، اسی کو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے ؎

چاک کردی تُرکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

اور یاد رکھئے کہ جب حکومت کا پہرے دار نہیں رہتا تو مذہب بازیچۂ اطفال (بچوں کا کھلونا) بن جاتا ہے، ابھی روس کو آپ نے نہیں دیکھا؟ اشتراکیت کا پہرے دار اور محافظ کون تھا؟ کمیونزم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اُس کا چراغ کبھی گل نہیں ہوگا، لیکن جب حکومت کا پہرہ ختم ہوا تو اشتراکیت پارہ پارہ ہوگئی، یہ ہوتی ہے حکومت کی طاقت اور یہ ہوتی ہے اقتدار کی مضبوطی۔

جہاد کسی حال میں منسوخ نہیں، چاہے امن کا دور ہو یا ظلم کا

اور حدیث شریف میں آتا ہے! الجهاد ماض إلى يوم القيامة لايبطله جور جائر ولا عدل عادل چاہے انصاف کا دور ہو چاہے امن کا دور ہو اور چاہے اندیشوں کا دور ہو، جہاد قیامت تک ختم نہیں ہوسکتا، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد کسی حال میں منسوخ ہے وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جہاد کسی حال میں بھی منسوخ نہیں ہوتا ہے، چاہے امن کا دور ہو چاہے ظلم کا۔ ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے باز کی زندگی راہبانہ

باز کہتا ہے کہ میں کبوتر اور فاختے کا بھوکا نہیں ہوں کیونکہ میں تو راہب ہوں کسی چیز پر گذر اوقات کر لیتا ہوں، اگر مسلمانوں کا لہو سرد ہو جائے گا تو سرد لہو سے کچھ نہیں ہوسکتا ؎

قاتل عدوك باللسان وإن قدرت فبالسنان
إن العداوة ليس يصلحها الخضوع مدى الزمان

دشمن سے کبھی صلح نہ کیجئے اگر ہو سکے تو زبان سے جنگ کیجئے اور اگر طاقت ہو تو نیزے اور تلوار سے جنگ کیجئے، کبھی بھی باعزت مصالحت بغیر قوت کے نہیں ہو سکتی ؎

والناس إن تركوا البرهان واعتسفوا
فليس للناس احدىٔ من الحرب

جب لوگ دلائل اور معقولیت کا انکار کرنے لگیں اور ڈھٹائی پر آجائیں تو پھر جنگ کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے جو اُن کو راہِ راست پر لائے، عربی شاعر نے بہت صحیح کہا ہے ؎

تأخرت استبقي الحياة فلم أجد
حياةً لنفسي مثل أن أتقدما

میں میدانِ جنگ میں جب پیچھے ہٹا کہ میں اپنی جان بچالوں تو میرے ضمیر کے اندر سے آواز آئی کہ زندگی آگے بڑھنے میں ہے پیچھے ہٹنے میں نہیں ہے ؎

يرى الجبناء أن العجز عقل
وتلك خديعة الطبع اللئيم

بزدل یہ سمجھتا ہے کہ بزدلی دانشمندی ہے، یہ دانشمندی نہیں ہے بلکہ یہ طبیعت کی دناءت اور اُس کی کمزوری کی علامت ہے، تو غرض یہ ہے کہ قرآن اس لئے محفوظ رہا کہ ہمیشہ قرآن پر تلوار اور خلافت کا پہرے دار بیٹھا رہا۔

حکومت اور دین جڑواں بچے ہیں

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ الملك والدين توأمان جس طرح جڑواں بچے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں، اسی طرح حکومت اور دین یہ دونوں جڑواں بچے ہیں، کہیں فرماتے ہیں کہ ایک بنیاد اور ایک عمارت ہے، عمارت بغیر بنیاد کے وجود میں نہیں آسکتی اور بنیاد پر کوئی عمارت نہ ہو تو بنیاد سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا، تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ؎

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اگر ایسے جوان آپ میں موجود ہیں جو یہ جذبہ رکھتے ہیں کہ اسلام کے لئے اگر ہماری جان کی ضرورت ہے تو جان حاضر ہے تو زہے نصیب جب یہ آیت اتری کہ ﴿إِنَّ اللّٰـهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (سورۂ توبہ:۱۱۱) کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے عوض میں تمہاری جان اور مال کو خرید لیا ہے تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کرلی ہے یعنی ہماری جانیں لے لی ہیں اور جنت ہم کو دے دی، ہم بیع توڑیں گے نہیں تو رسول اکرم ﷺ مسکرائے اور فرمایا کہ اللہ کہاں توڑنے والا ہے؟ ﴿وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللّٰـهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ﴾ (سورۂ توبہ:۱۱۱) اللہ سے زیادہ وفادار کون ہوسکتا ہے؟ لہٰذا جو تم نے بیع کی ہے اُس سے خوش ہو جاؤ۔

مؤمن کی زندگی ایسی ہونی چاہئے

مؤمن کی زندگی کیسی ہونی چاہئے؟ کہ محفل یاراں ہو تو ریشم کی طرح نرم ہو جائے اور اگر حق و باطل کی جنگ ہو تو فولاد کی جیسی سختی اُس کے اندر ہونی چاہئے۔

علامہ اقبالؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ شکار کو گئے، غلام بھی ساتھ تھا، آدھی رات کو شکار کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے تو فجر کا وقت ہو گیا جنگل میں حضرت نے اذان دی اور اذان دینے کے بعد دو رکعت نماز سنت پڑھی پھر نماز فرض پڑھانے لگے، حضرت امام تھے اور غلام مقتدی تھا ؎

شیر ببر آمد بدید از طرفِ دشت
از خروشِ اُو فلک لرزندہ گشت

عین اُسی وقت جنگل کی طرف سے شیرِ ببر نکلا، اُس کی دھاڑ کا یہ عالم تھا کہ محسوس ہوتا تھا کہ آسمان لرز اٹھا ہے ؎

بوئے انساں دادش از انساں خبر
پنجہ عالمگیر را زد بر کمر

انسان کی بو پا کر شیر کو معلوم ہو گیا کہ انسان موجود ہے، چنانچہ وہ آیا اور نماز میں مصروف

حضرت عالمگیرؒ کی کمر پر پنجہ مارا ؎

دست شہ نادیدہ خنجر برکشید
شرزہ شیرے را شکم از ہم درید

حضرت عالمگیرؒ نے کوئی پرواہ نہیں کی اور آنکھ اٹھائے بغیر خنجر کھینچا اور غضبناک شیر کا پیٹ چیر کر رکھ دیا ؎

دل بخود راہے نداد اندیشہ را
شیرِ قالیں کرد شیرِ بیشہ را

حضرت نے ذرہ برابر خوف وہراس محسوس نہیں کیا اور جو جنگل کا شیر تھا اُس کو قالین کا شیر بنا دیا ؎

باز سوئے حق رمید آں ناصبور
بود معراجش نماز با حضور

اُس کے بعد پھر نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور پھر اُسی طرح سے نماز پڑھنے لگے، تو علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ یہ مؤمن کی زندگی کی دو تصویریں ہیں، اب ایسا کھڑے ہیں کہ جیسے آنکھ ہے مگر دیکھ ہی نہیں سکتے، اور ہونٹ ہیں تو جیسے گویائی کی اِن میں طاقت ہی نہیں ہے اور ہاتھ ہیں تو جیسے اِن میں حرکت کا یارا نہیں اور پیر ہیں تو جیسے چلنے کی اِن میں سکت ہی نہیں اور ابھی شیر آیا تھا تو سراپا وجود بن گئے تھے، یہ مؤمن کی زندگی کے دو رُخ ہیں کہ جب وہ حق کے سامنے ہو تو بے بس اور ناتواں ہو جائے اور اپنے آپ کو توڑ دے اور جب باطل سامنے آئے تو سراپا وجود بن جائے ؎

ایں چنیں دل خود نما و خود شکن
دارد اندر سینۂ مؤمن وطن

ایسا دل جو اپنے آپ کو توڑ بھی دے اور اپنی نمائش بھی کر دے ایسا ہی خود نما اور خود شکن دل مؤمن کے سینے میں جگہ پاتا ہے، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

❁❁❁

تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا

از: مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ

{ملک کے شہرۂ آفاق خطیب اور ممتاز و نامور عالمِ دین حضرت مولانا مفتی شکیل احمد سیتاپوریؒ سابق استاذ دار العلوم دیوبند و دار العلوم الاسلامیہ بستی نے یہ معرکۃ الآراء، بصیرت افروز، فکر انگیز اور معلومات افزا تقریر اہالیانِ کشمیر کے خواص وعوام کے ایک بڑے مجمع کے سامنے ایک تعلیمی ادارے کے سنگِ بنیاد کے موقع پر فرمائی۔

عزیزم مولوی حافظ مسعود الرحمٰن سلمہ متعلم درجہ عربی ششم دار العلوم الاسلامیہ نے انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے اس کو نقل کیا، تقریر کی اہمیت وافادیت کے پیشِ نظر عزیز مکرم مولانا امتیاز احمد قاسمی استاذ دار العلوم الاسلامیہ نے بڑے سلیقہ سے اسے مرتب کرکے ذیلی عناوین کا بھی اضافہ کیا، دونوں کے شکریہ کے ساتھ افادۂ عام کے لئے اس کو مجلّہ ''فکرِ اسلامی'' میں شائع کیا جارہا ہے} (مدیر)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين، خاتم النبيين، محمد صلى الله عليه وآله وسلم ومن تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين. أما بعد!

تمہیدی کلمات

بھائیو! تقریر سے پہلے ایک بات عرض کردوں کہ مولانا مفتی اعجاز صاحب ایک بڑے عالم ہیں اور ان کے اساتذہ کہتے ہیں کہ وادیٔ کشمیر میں ایسے دو ایک ہی عالم ہیں یعنی اتنی استعداد اور اتنی قابلیت والے اور ماشاء اللہ معتبر اور ایماندار ہیں، اگر زکوٰۃ آپ نکالتے ہیں یا صدقہ دیتے ہیں یا امداد کرتے ہیں اور معتبر آدمی مل جائے تو یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آپ کی زکوٰۃ صحیح ہاتھوں میں پہنچ

گئی تو اِنہوں نے تقریباً ایک کروڑ کی زمین خریدی ہے، ہزاروں اسکوائر فٹ۔ اس میں بہت بڑا ڈگری کالج قائم ہوسکتا ہے، اتنی بڑی زمین انہوں نے خریدی اور اتنی ہی زمین خریدنی چاہیے، بڑے ادارے کے لئے۔ تاکہ کشادگی سے عمارت بن سکے اور سارے پروگرام مکمل ہوسکیں، آب وہوا وہاں کی اچھی ہو، تو یہ ایک کروڑ کی تو صرف زمین خریدی ہے پھر اس کے بعد تعمیر ہے اور یہ آپ ہی کے بھروسے پر۔ ویسے تو اللہ کا بھروسہ سب سے پہلے ہوتا ہے، پھر عوام کا بھروسہ ہوتا ہے، آپ کے بھروسے پر انہوں نے یہ زمین خریدی ہے۔

یا مکن با فیل بانان دوستی
یا کہ درِ افراز کن بالائے فیل

یا تو ہاتھی والوں سے دوستی نہ کرو اور یا ہاتھی سے بڑا دروازہ رکھو کیونکہ وہ تو ہاتھی پر چڑھ کے آئے گا تو اگر دروازہ بڑا نہیں ہوگا تو آئے گا کیسے تو یا تو مدرسے کھولو نہیں اور اگر مدرسہ کھل گیا ہے تو پھر آپ اپنا دل بڑا رکھئے۔ السخی قریب من اللہ، قریب من الناس، قریب من الجنۃ، بعید من النار. سخی اللہ سے بھی قریب ہے، لوگوں سے بھی قریب ہے، جنت سے بھی قریب ہے اور دوزخ سے دور ہے۔ والبخیل بعید من اللہ، بعید من الناس، بعید من الجنۃ، قریب من النار" اور بخیل (جس کو ہمارے یوپی میں کنجوس، مکھی چوس کہتے ہیں) اللہ سے بھی دور، لوگوں سے بھی دور، جنت سے بھی دور اور دوزخ سے قریب ہے، دیکھئے بخل بانجھ ہے جیسے بانجھ عورت کے پیٹ سے کچھ پیدا نہیں ہوتا اسی طرح بخل کی کوکھ سے یا بخل کے پیڑ سے کچھ نہیں نکلتا، نہ مدرسہ نکلتا ہے نہ مسجد نکلتی ہے، نہ یتیم خانہ نکلتا ہے نہ مسافر خانہ نکلتا ہے اور سخاوت یہ صاحبِ اولاد عورت کی طرح ہے کہ اس کی کوکھ سے مدرسہ بھی وجود میں آتا ہے، مسجد بھی وجود میں آتی ہے اور مسافر خانہ بھی وجود میں آتا ہے اور رفاہی کام بھی ہوتے ہیں۔

قومِ مسلم کے زوال کے اسباب

مسلمان صدیوں سے جب سے اُن کا زوال ہوا ہے اور حکومتیں ان کے ہاتھوں سے چلی گئیں تب سے یہ بخیل ہوگئے ہیں، کنجوس ہوگئے ہیں، آپ دیکھئے! پورے ہندوستان کے اندر آپ کو کالج

ملیں گے، ایک ایک کالج بیس بیس کنال (ایک لاکھ چھتیس ہزار اسکوائر فٹ) کے اندر ہوتا ہے، سب غیر مسلموں کے نام پر ہیں، کہیں کوئی شیا چرن کے نام پر، کوئی جے دیال کے نام پر اور کوئی ہنومان کے نام پر ہے، مسلمانوں کے نام بہت کم کالج ہیں حالانکہ وہاں زمین داری ونوابی مسلمانوں کی تھی، وجہ کیا ہے؟ مسلمانوں نے بخل کیا، کنجوسی کی، اگر زمین دیتے اور دریا دلی کا مظاہرہ کرتے تو ان کے نام پر کالج ہوتے یہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے جو حقیقت ہے وہ میں بتا رہا ہوں، جھوٹی تعریفوں کے خول میں جینے کی عادت غلط ہے۔ یُحِبُّوْنَ أَن یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا۔ ایسا کام جو ہم نے نہیں کیا، اس کا کریڈٹ ہم لے لیں اور اس کا سہرا ہمارے سر بندھ جائے یہ غلط ہے، یہ منافقوں کی عادت ہے، اگر مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ خرچ کرنے والی قوم ہوتی تو خدا کی قسم زوال کا شکار ہی نہ ہوتی، اس لئے کہ جو مال خرچ کر سکتا ہے وہ جان بھی دے سکتا ہے اور مال وجان خرچ کرنے والی قوم دنیا میں قیادت کرتی ہے، دنیا میں ذلیل ومحکوم نہیں ہوتی، یہ جو کہتے ہیں کہ مسلمان بہت خسارے میں ہیں، غلط ہے۔ ارے سو، دو سو روپئے دے دینے پر بھی کوئی خرچہ ہے؟ تو غیر مسلم جب بیدار ہوئے تو انہوں نے زمینیں دیں، کالج کھلے اور ڈگری کالج کھلے، آپ نے پیسے کو دانت سے پکڑا، آپ نے پیسہ مٹھی میں بند کر لیا، ہم پیسے کے لئے سانپ بن گئے، جو ہمارے مالدار ہیں ایسے ہیں جیسے سانپ خزانے کے اوپر پہرہ دیتا ہے، کسی کو قریب نہیں آنے دیتا، نہ خود فائدہ اٹھاتا ہے نہ کسی کو فائدہ اٹھانے دیتا ہے، وہی حال ہمارا ہو گیا، تو اس لئے بھائیو! یہ ایک کروڑ کی انہوں نے زمین خریدی پھر اس کے لئے نہ جانے کتنا پیسہ تعمیر میں خرچ ہوگا مگر زمین کے پیسے تو پہلے ہی ادا کرنے پڑیں گے یکمشت۔ اور تعمیر دھیرے دھیرے ہوگی ؎

بنایا ہے چڑیوں نے جو گھونسلا
تو ایک ایک تنکا اکٹھا کیا

تو اس وجہ سے مولانا کی مدد کرو اگر مولانا کا حوصلہ ٹوٹ گیا، تو افسوس اور بڑے خسارے کی بات ہوگی۔ آدمی حوصلے ہی سے کام کرتا ہے، اگر چیونٹی حوصلے کے ساتھ چلے تو منزل تک پہنچ جائے گی اور اسپِ تازی (عربی گھوڑا) اگر اس کا حوصلہ ختم ہو گیا تو وہ منزل تک نہیں پہنچ سکتا اسی کو شاعر نے کہا ہے کہ ؎

مجھے یہ ڈر ہے کہ دلِ زندہ تُو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

علماء آپ کے بچوں کا مستقبل سنوارتے ہیں

اس لئے آپ حضرات ان کی مدد کریں، کوئی زبان سے تعریف کردے کہ مولانا آپ نے جو زمین خریدی، اس سے ہم کو بہت خوشی ہوئی، کوئی یہ کہہ دے کہ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم آپ کی مدد کریں گے یا ابھی مدد کرے تو مولانا کا حوصلہ بڑھ جائے گا اور انشاء اللہ مولانا چونکہ صلاحیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے یہ اچھا ادارہ قائم کریں گے، یہ اپنے لئے کوئی جائیداد نہیں بنا رہے ہیں، آپ کے بچوں کا مستقبل بنا رہے ہیں، آپ غور فرمایئے، بچے پیدا آپ کریں اور سنواریں یہ، تو آپ پر احسان ان کا ہے کہ نہیں۔ تو اس لئے آپ ان کی مدد ضرور کیجئے تا کہ ان کا حوصلہ نہ ٹوٹے۔

کشمیر ادباء، شعراء، صوفیائے کرام اور محدثین کی سرزمین ہے

کشمیر کے بارے میں جیسا کہ ہمارے مولانا عبد اللطیف صاحب لکھیم پوری نے فرمایا کہ یہ بڑی زرخیز زمین ہے یعنی کشمیر میں بولتے ہوئے ہمیں ہمت نہیں ہوتی ہے، کشمیر نے شاعر پیدا کیا وہ بھی علامہ اقبالؒ جیسا۔ جو پوری دنیا کا سب سے بڑا شاعر کہا جا سکتا ہے، ایک غنی کشمیریؒ تھے، اُن کے اندر ایک عجیب بات تھی وہ جب گھر میں رہتے تھے تو دروازہ بند کر لیتے تھے اور جب گھر سے باہر نکلتے تو درواز ہ کھلا رہتا تو کسی نے ان سے کہا ارے! جب لوگ گھر کے اندر رہتے ہیں تو دروازہ کھلا رہتا ہے کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں اور جب باہر نکلتے ہیں تو دروازہ بند کر لیتے ہیں اور آپ الٹا کرتے ہیں کہ جب رہتے ہیں تو دروازہ بند کر لیتے ہیں اور جب نکلتے ہیں تو کھول دیتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اس گھر کے اندر مجھ سے زیادہ قیمتی چیز ہے کون؟ جب میں نکل گیا تو گھر تو بے قیمت ہو گیا، ان کا ایک شعر ہے ؎

غنی روزِ سیاہِ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

غنی یہ دیکھو یعقوبؑ کی بدقسمتی۔ ایسا نہیں کہنا چاہئے وہ نبی ہیں اس لئے یہ لفظ مناسب نہیں

حالانکہ یہ شاعرانہ زبان ہے، یہ عقیدے کی زبان نہیں، یعنی غنی! حضرت یعقوب علیہ السلام کی قسمت دیکھو کہ یوسفؑ ہے تُو ان کی آنکھ کا تارا لیکن آنکھیں ٹھنڈی ہو رہی ہیں عزیزِ مصر اور مصر کی ملکہ زلیخا کی، تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے فرزند دوسروں کی ترقی اور دوسروں کے فروغ کا کام کر رہے ہیں، حالانکہ ہم لوگ ان کی صلاحیتوں کے زیادہ حقدار تھے، تو یہ کب ہوتا ہے جب ہم اپنے فرزندوں کی قدر دانی چھوڑ دیتے ہیں۔

تو علامہ اقبالؒ اور غنی کشمیریؒ اور اسی طرح سے علامہ انور شاہ کشمیریؒ۔ تو پورا ہندوستان سوُ سنار کی مثال ہے، یوپی ہو چاہے مہاراشٹر ہو، چاہے مدھیہ پردیش ہو اور کشمیر ایک لوہار کی طرح ہے کہ لوہار ایک مرتبہ گھن چلاتا ہے تو سنار کے سوسو مرتبہ ہتھوڑی چلانے سے وہ کہیں بھاری پڑتا ہے تو بھائیو! آپ تو سوسنار کے مقابلے میں ایک لوہار کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک شاعر پیدا کیا تو دنیا بھر میں چھا گیا، ایک محدث پیدا کیا علامہ انور شاہ کشمیریؒ تو سارے لوگوں نے اُن کا لوہا مانا اور اُن کی کتاب ''فیض الباری'' عربوں کے سرہانے رکھی رہتی ہے۔ ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

کشمیر میں جو دین کا مزاج ہے وہ کسی ریاست میں نہیں

میں سچ کہتا ہوں کہ اِس ریاست کشمیر کے اندر جو دین کا مزاج ہے، وہ کسی ریاست میں نہیں ہے، پنچانوے فیصد لوگوں کے چہروں پر داڑھیاں ہیں اور عظمتِ رسول ﷺ کے لئے ہر وقت سر بکف رہتے ہیں، تو یہ بہت اچھی ریاست ہے لیکن تھوڑا سا آپ کو توجہ کرنی پڑے گی ورنہ آپ بدنام ہو جائیں گے، آپ کی ناک کٹ جائے گی، اگر آپ نے مولانا اعجاز صاحب کو تنہا چھوڑ دیا۔

جرمِ کمزوری نا قابلِ معافی گناہ

لیکن ایک جرم ایسا ہے جس کو دنیا کبھی نہیں معاف کرتی ہے، نہ کبھی دنیا نے معاف کیا ہے وہ کیا ہے؟ جرمِ ضعیفی، کمزوری کو دنیا کبھی معاف نہیں کرتی ہے ع

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اس لئے کمزور بننا یہ ثواب نہیں ہے، المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف. طاقتور مؤمن کمزور مؤمن سے کہیں بہتر ہے۔

عربی شاعر ابو العلاء معرّی کی ایک نصیحت آموز حکایت

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ ابو العلاء معرّی نابینا تھا، مگر بڑا اعلیٰ درجے کا عربی شاعر تھا، دیکھئے! اس نے کیا کہا ؎

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گذر اوقات

یعنی گوشت نہیں کھاتا تھا، سبزی ساگ کھاتا تھا حالانکہ گوشت خور قوم تھی اُس کی، عرب تھا وہ ؎

اِک دوست نے بُھونا ہوا تیتر اُسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اِسی ترکیب سے ہو مات

یعنی تیتر کا شکار کیا اور اس کے بعد اس کو بھونا اور اس کو خوب مسالے میں لگایا اور اس کے بعد پیش کیا۔ مسالے کی خوشبو آتی ہے تو جو آدمی نہ کھانا چاہے وہ بھی کھالیتا ہے، ایک بڑے عالم تھے، وہ بادشاہ مہدی باللہ کے یہاں گئے، اس کے کھانے کے دستر خوان پر، کہا کہ ہم تمہارا کھانا نہیں کھائیں گے۔ تو بادشاہ نے کہا، ارے کھانا لگاؤ جب خوشبو آئے گی تو دیکھنا، واقعی جب خوشبو زعفران و مسالے کی آئی تو وہ کھانے کے لئے تیار ہو گئے، خوشبو ایسی چیز ہوتی ہے ؎

یہ خوانِ تروتازہ معرّی نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران ولزومات

(غفران ولزومات اس کے دیوان کی کتابیں ہیں، اس نے دو کتابیں لکھی ہیں، ایک کا نام ہے غفران۔ دوسرے کا نام ہے لزومات)

اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تُو
تیرا وہ گنہ کیا تھا، یہ ہے جس کی مکافات؟

یعنی اے معصوم پرندے یہ بتاؤ تم نے کیا قصور کیا تھا کہ تم کو تیر مارا گیا، سینے پہ تم نے تیر کھایا، اس کے بعد تڑپے پھر تم کو ذبح کیا گیا، پھر تمہاری بوٹیاں بنائی گئیں، پھر آج ہماری بتیسی کے اندر پسنے کے لئے تم کو پیش کیا گیا، تم نے کیا قصور کیا تھا، چوری کی تھی، ڈکیتی کی تھی، رہزنی کی تھی، پھر اس کے بعد کہا تم کیا بولو گے ہم سے سنو! ؎

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تم زمین کے کیڑے بنے رہے، حالانکہ آسمان وزمین کی بلندیاں تم کو بلندی کی دعوت دے رہی تھیں تم اوپر چلے جاتے کسی تیر چلانے والے کے تیر اور کسی گولی چلانے والے کی گولی وہاں تک نہیں پہنچتی، اس کی رسائی سے تم آگے ہوجاتے ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

جب سے اللہ نے یہ دنیا پیدا کی ہے، اُس وقت سے قیامت تک یہ فتویٰ ہمیشہ جاری رہے گا۔

طاقتور مسلمان، کمزور مسلمان سے بدرجہا بہتر ہے

جو قومیں کمزور ہوتی ہیں، وہ کتوں کی موت ماری جاتی ہیں، اپنی موت نہیں مرتیں تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ کمزور ہونا کوئی کارِ ثواب نہیں ہے، اسی لئے رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف۔ طاقتور مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے۔ طاقتور مسلمان چاہے جسم کے اعتبار سے طاقتور ہو، چاہے دماغ کے اعتبار سے طاقتور ہو، چاہے تعلیم کے اعتبار سے طاقتور ہو۔ بیماری اور جہالت بھی ایک کمزوری ہے۔ جسمانی ضعف بھی ایک کمزوری ہے، رائے کی کمزوری بھی ایک کمزوری ہے۔

شعورِ صحیح کا فُقدان تباہی و بربادی کی علامت ہے

علماء نے لکھا ہے کہ: طوفانِ بادوباراں سے قوموں کو وہ نقصان نہیں پہنچتا، زلزلے آجائیں، بارش آجائے، سیلاب آجائے اور بستیوں کو بہالے جائے اس سے بستیوں کو وہ نقصان نہیں پہنچتا، جو

شعورِ صحیح کی محرومی سے پہنچتا ہے، صحیح شعور جب نہیں ہوتا تو قومیں برباد ہو جاتی ہیں ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی اگر کل نہ ڈوبی

ایک بادشاہ کی شہزادے کو نصیحت

ایک بادشاہ نے اپنے شہزادے کو سپہ سالار بنایا اور جب وہ محاذ پر پہنچ گیا تو اس کے بعد کہا بیٹا! اللہ نے عزت میں اور راحت میں بیر رکھا ہے، عزت اور راحت میں دشمنی ہے، عزت کو لینا ہے تو راحت کو ترک کرو اور اگر راحت اختیار کرنا ہے تو عزت کو بھول جاؤ، عزت بھی ہو اور کسی شوق سے تم محروم نہ رہو، کھانے کا شوق، پینے کا شوق، پہننے کا شوق، گپ بازی کا شوق، عیاشی کا شوق اور عزت بھی ہو، یہ دو چیزیں (عزت وراحت) نہیں جمع ہو سکتیں۔

تو اس لئے میرے دوستو! مضبوط بنو، صحت کے اعتبار سے بھی، تعلیم کے اعتبار سے بھی اور شعور کے اعتبار سے بھی، آپ کے اندر بلندی ہو اور اگر آپ جاہل رہے تو وہ آپ کا گناہ ہے، دوسرے کا گناہ نہیں ہے اگر رائے کے اعتبار سے آپ کمزور ہیں تو وہ آپ کا گناہ ہے، نشہ استعمال کروگے، تو سگریٹ جیسی ٹانگیں خاک بن جائیں گی ؎

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار اُن سے
یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

اگر کمزور بنوگے تو وہ تمہارا جرم ہے اور مجرم ہی کو سزا ملتی ہے ﴿أَلَّا تَـــــزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْـرىٰ﴾ جرم آپ کریں، سزا دوسرا پائے یہ نہیں ہو سکتا، جسم اپنا کمزور آپ کریں، آپ ہی دبوچے جائیں گے، بیماری کے اسباب آپ مہیا کریں، بیماری آپ کو پچھاڑے گی، دوسرے کو نہیں پچھاڑے گی، یہ اللہ کے انصاف کے خلاف ہے، تو اس لئے میرے دوستو! کیا آج ہمارا نوجوان، وہی نوجوان ہے، ملت کی آنکھ کا تارا؟ ہرگز نہیں! آج کا نوجوان تو بیڑی سگریٹ پینے والا، لڑکیوں

کے اسکول کے پاس کھڑے ہو کر لڑکیوں کو تاکنے والا، آنکھیں سینکنے والا، ہر خواہش کے پیچھے دوڑنے والا ہے، کیا یہ نوجوان قوم کی نیّا پار کر سکتا ہے؟۔ ؎

وہی جواں ہے ملت کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

اگر کہیں دشمن مقابل میں آتا ہے اور آبرو پامال کرتا ہے جسم پہ حملہ کرتا ہے عزت پہ حملہ کرتا ہے تو یہ جوان شیرِ غاب یعنی جھاڑی کا شیر بن جاتا ہے۔

جس کے پاس ایک وقت کا کھانا ہو اس کے لئے سوال کرنا جائز نہیں

تو غریب ہونا کارِ ثواب نہیں ہے، سن لو! اچھی طرح جو ہاتھ پیر ہلا سکتا ہے اس کو دوسرے کی کمائی کھانا حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ مزاج نہیں تھا لو یعلم الناس ما فی المسئلة ما مشیٰ الیھا احد. اگر لوگ سمجھ لیں کہ سوال میں کتنی ذلت ہے اور اللہ کو سوال کتنا ناپسند ہے تو کوئی سوال کا تصور تک نہ کرے۔

من سأل وله ما يغني جاء يوم القيامة وفی وجهه كدوح أو خدوش.
اگر بے ضرورت کوئی سوال کرے گا، گھر میں کھانا ہے اور دوسرے کے سامنے دستِ سوال دراز کیا تو قیامت کے دن آئے گا سوال کرنے والا گدا گر اِس حال میں کہ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا، اس طرح ذلیل ہوگا محشر میں اربوں انسانوں کے سامنے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک انصاری صحابی آئے اور سوال کیا، آپ ﷺ تو رحمتِ عالم تھے، اپنے ایک امتی کا غم اور غریبی اور فقر کو دیکھ کر حضرت کی طبیعت پگھل گئی، آپ نے فرمایا أما فی بيتك شئ. کیا تمہارے گھر میں کچھ نہیں ہے؟ جو تم اِس ذلت پر آمادہ ہوئے اور سوال کر رہے ہو؟ تو وہ کہنے لگے اے اللہ کے رسول ﷺ میرے پاس کچھ نہیں ہے، آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا: ارے کچھ تو ہوگا؟ تو اُنہوں نے کہا ہاں! حلس نلبس بعضه ونبسط بعضه وقَعْبٌ نشرب فيه من الماء. ایک چادر

ہے، آدھی اوڑھ لیتے ہیں آدھی بچھا لیتے ہیں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پی لیتے ہیں۔ یہ کونسی چیز تھی گھر کے اندر؟ یہ کوئی چیز ہے؟ معمولی سے معمولی فقیر کے یہاں اس سے زیادہ سامان ہوتا ہے لیکن رسول ﷺ اور اسلام کا مزاج دیکھو! فرمایا تمہارے گھر میں کیا ہے؟ اُنہوں نے کہا کچھ نہیں ہے ایک کمبل ہے، آدھا بچھا لیتے ہیں، آدھا اوڑھ لیتے ہیں، ایک پیالہ ہے۔ جس میں پانی پیتے ہیں، فرمایا: إئتني بهما۔ دونوں کو میرے پاس لے کر آؤ۔ انہوں نے دونوں چیزیں مسجد نبوی میں لا کر حضور ﷺ کے ہاتھ میں دے دیں، آپ ﷺ نے فرمایا: من يشتري هذين؟ ان دونوں چیزوں کو کون خریدے گا، ہم بیچ رہے ہیں حالانکہ وہ پھٹی پرانی چادر تھی کوئی نہ لیتا، لیکن حضور ﷺ کے ہاتھ میں تھی تو قیمتی ہوگئی، تو ایک صاحب نے کہا: أنا آخذهما بدرهم۔ ہم ایک روپئے میں لینے والے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: من يزيد؟ ایک درہم سے زیادہ اور کون دے گا؟ تو دوسرے نے کہا: أنا آخذ هما بدرهمين. ہم دو روپئے میں لینے کے لئے تیار ہیں، حضور ﷺ کے یہاں تکلف نہیں تھا دو روپئے ٹھیک تھے، فرمایا لاؤ دو روپئے، لے لیا اور وہ دونوں چیزیں اس کو دے دیں، حضور ﷺ نے فرمایا: ایک روپئے کا غلہ لے کر اپنے گھر والوں کو دے آؤ اور ایک روپئے کی کلہاڑی میرے پاس لے کر آؤ، چنانچہ ایک روپئے کا غلہ گھر دے آئے اور کلہاڑی لے کر آپ کے پاس آئے، حضور ﷺ نے ایک صحابی سے یا انہیں سے فرمایا یہ ببول ہے، اس کی لکڑی کاٹ کر لاؤ دستے کے لئے! چنانچہ وہ لے کر آئے، مسجد نبوی میں، امام الانبیا ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس پر دستہ نصب کیا اور فرمایا کہ اذهب واحتطب ولا اربنك خمسة عشر يوماً۔ جاؤ لکڑی کاٹو اور بیچو اور پندرہ دن تک دکھائی نہ دینا۔ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ اگر وہ مسجد نبوی میں آتے تو وہ حضور ﷺ کو دکھائی دیتے، اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ بچوں کی کمائی کے لئے اور فقر و فاقہ کو دور کرنے کے لئے اس کی اجازت ہے کہ تم کہیں بھی نماز پڑھ لو، اپنے محلے کی مسجد میں، مسجد نبوی میں نہ آؤ، جس میں ایک نماز کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے ثواب کے برابر ہے، وہاں نہ آؤ، اپنے بچوں کی فکر کرو، انہوں نے ایسا کیا، پندرہ دن کے بعد آئے تو دس روپئے کمائے، نئے کپڑے پہن کر آئے، چہرے کے اوپر تازگی تھی، کیونکہ فقر و فاقہ نہیں تھا اور گھر میں غلہ اور کپڑے دے آئے حضور ﷺ خوش ہوگئے، فرمایا یہ بہتر ہے یا گداگری بہتر ہے؟ تو یہ ہے اسلام کا مزاج! تو

میں آپ سے بتاتا ہوں، غریب ہونا کارِثواب نہیں ہے، اللہ کسی کو غریب کردے تو اور بات ہے لیکن اپنی کاہلی سے، اپنی آرام طلبی سے اور اپنی بیٹھ کر کھانے کی عادت سے توبہ کرو اور تہیہ کرلو کہ باپ کی کمائی بھی ہم کو نہیں کھانا ہے، بیٹے کی کمائی بھی ہم کو نہیں کھانا ہے۔ کاد الفقر أن يكون كفراً۔ غریبی کفر تک پہنچادیتی ہے، جو غریب آدمی ہوتا ہے نہ اس کی کوئی عزت ہوتی ہے نہ اس کا کوئی مذہب ہوتا ہے، نہ اس کی جان اس کے قبضے میں ہوتی ہے، ساہوکار اس کی عزت بھی لیتا ہے اور اس کا مذہب بھی داؤ پر لگادیتا ہے اور اس کی جان بھی خطرے میں ہوتی ہے تو میں اپنے نوجوانوں سے عرض کرتا ہوں کہ انہیں سے امید ہے کہ یہ قوم کی نیا پار کریں گے، ہر شئ کو مسلسل جنبش ہے، دنیا میں ہر چیز حرکت میں ہے چاہے سورج ہو، چاہے چاند، راحت کا جہاں میں نام نہیں، ارے نوجوانو! تم بھی راحت اور آرام اختیار نہ کرو۔ ؎

ہر شئ کو مسلسل جنبش ہے راحت کا جہاں میں نام نہیں
اِس عالمِ سعی وکوشش میں انساں کے لئے آرام نہیں

عقل، علم وہنر اور مال ودولت اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں

کاش ہمارے نوجوان تہیہ کرلیں تعلیم وتربیت سے آراستہ ہونے کا، اس لئے کہ تعلیم وتربیت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، کسی دانشمند سے پوچھا گیا کہ سب سے بڑی نعمت اللہ کی کیا ہے تو اس نے کہا سب سے بڑی نعمت اللہ کی، عقل ہے کیونکہ عقل سے دین ودنیا دونوں کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ پھر پوچھا گیا اگر عقل نہ ہو؟ تو اُس نے کہا پھر علم وہنر سب سے بہتر ہے، پھر پوچھا گیا اگر علم وہنر نہ ہو تو اُس نے کہا مال ودولت سب سے بہتر ہے، پھر پوچھا گیا اگر مال ودولت بھی نہ ہو تو اُس نے کہا اس کے اوپر بجلی کا گرنا بہتر ہے، وہ زمین کا بوجھ ہے، دنیا سے ختم ہوجائے تو اچھا ہے۔ ؎

کسی نے یہ اک مردِ دانا سے پوچھا
کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا؟
کہا عقل، جس سے ملے دین ودنیا
کہا گر نہ ہو اس سے انساں کو بہرہ

کہا پھر اہم سب سے علم وہنر ہے
کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے
کہا گر نہ ہو اس کو یہ بھی میسر
کہا مال ودولت ہے پھر سب سے بڑھ کر
کہا دَر ہو یہ بھی اگر بند اس پر
کہا اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر
وہ ننگِ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

اے میرے عزیزو! کب غفلت سے باز آؤگے؟ کب تمہاری آنکھیں کھلیں گی؟ یہ کانوں کی ڈاٹ کب نکالوگے؟ سنو! آنکھیں کھول کر دنیا میں رہو، تمہاری قوم پستی میں پہنچ چکی ہے، خدا کے واسطے تعلیم حاصل کرو، عقل سے کام لو، اللہ نے عقل دی ہے، مال ودولت اکٹھا کرو، مال ودولت کے بغیر دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتا ہے مگر مال ودولت کو جیب میں رکھو، دل میں نہ رکھو۔

دنیا کی محبت دل میں رکھنا دنیا داری ہے

آنیکار عبد الشکورؒ ایک چوتھائی مدراس اُن کا تھا (وہ بندۂ خدا بڑا مال دار تھا، بہت سخی بھی تھا، اللہ کی راہ میں خوب خرچ بھی کرتا تھا) اُن کا جب انتقال ہوا تو ایک بڑے عالم کو بلایا گیا نمازِ جنازہ پڑھانے کے لئے، وہ جب آگے بڑھے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ اُس شخص کا جنازہ ہے کہ مال جس کی جیب میں رہتا تھا دل میں نہیں۔ ؎

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش ونقرۂ وفرزند وزن

چاندی سونا، تجوریاں بھرنا، یہ دنیا داری نہیں ہے، دنیا کی محبت دل میں رکھنا دنیا داری ہے، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ کے یہاں کتنے اونٹ اشرفیوں سے، کھجوروں سے بھرے ہوئے آرہے ہیں، اور وہ اعلیٰ درجے کے صحابی ہیں، رسول ﷺ نے ان کے جیتے جی، ان کی زندگی میں ان کو جنت

کی بشارت دی اور وہ عشرۂ مبشرہ میں سے تھے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عبد الرحمن بن عوف فی الجنة۔ اور حضرت عمرؓ نے چھ آدمیوں کی جب کمیٹی بنائی، خلافت کو طے کرنے کے لئے تو انہوں نے ایک نام ان کا بھی منتخب کیا، اتنے اعلیٰ درجے کے انسان تھے اور اتنا پیسہ تھا، تو کیا پیسہ رکھنے سے آدمی دنیادار ہوتا ہے؟ زمیندار بننے سے دنیادار ہوتا ہے؟ کوٹھیاں بنانے سے دنیادار ہوتا ہے؟ دنیا کی ضرورت پڑتی ہے۔ دنیا کی محبت دین کے تقاضے میں حائل ہو جائے، یہ ہے دنیاداری، کشتی پانی میں چلتی ہے جب تک پانی باہر ہے کشتی کے، تو کشتی کے لئے نجات کا سامان ہے کیونکہ کشتی پانی ہی میں چلے گی، خشکی میں نہیں چلتی لیکن جب پانی کشتی میں آجائے تو کشتی کو ڈوبنے سے کوئی نہیں بچا سکتا، اسی طرح سے مال جب باہر رہے، جیب میں رہے کوئی حرج نہیں ہے لیکن جب مال آپ کے دل میں آجائے اور مال کی محبت کی وجہ سے ماں کا حق ادا نہ کرو، باپ کا حق ادا نہ کرو، ملت کا حق ادا نہ کرو، قوم کا حق ادا نہ کرو تو پھر وہی ہے کہ اب کشتی میں پانی آ گیا ہے، اب کشتی کو ڈوبنے سے کوئی نہیں بچا سکتا، آپ کی آخرت برباد ہو جائے گی، آپ نے پیسے کو دانت سے پکڑ لیا، آپ نے پیسے کو اپنا ماتحت نہیں سمجھا، آپ نے پیسے کو اپنا مال نہیں سمجھا بلکہ آپ پیسے کے غلام ہو گئے، تو بہر حال میں نوجوانوں سے یہ کہہ رہا تھا کہ بھائی کماؤ، مال حاصل کرو، طاقتور بنو، تعلیم حاصل کرو۔

یورپ کی تاریخ صرف پانچ سو سال کی ہے اور آپ کی پندرہ سو سال کی

میں اپنے نوجوانوں سے کہا کرتا ہوں کہ سو دو سو سال سے تم احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے، میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ انگریزوں کی تاریخ پانچ سو سال کی تاریخ ہے، یہ سب حاضرینِ محفل تاریخ داں اور پڑھے لکھے لوگ ہیں، میں کوئی صحرا میں نہیں آواز لگا رہا ہوں اور بیربل کی کہانی نہیں سنا رہا ہوں، پانچ سو سال پہلے انگریز دور گمنامی میں تھا اور لندن کے اندر کیچڑ تھا، پانچ سو سال پہلے وہاں نہ سڑکیں بنی تھیں، نہ مکانات تھے نہ روشنی تھی اور آپ کا شہر بغداد پانچ سو سال پہلے وہاں ہُن برستا تھا، سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر، آپ کو اندازہ نہیں ہوگا، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، ”عیاں راچہ بیاں“ اسی طرح میں جو بات کہنے جا رہا ہوں اس کا ثبوت موجود ہے، آپ کے خلفاء اور آپ کے بادشاہوں کا اتنا رعب تھا کہ یورپ کے بادشاہ اپنے سونے اور چاندی کے سکوں کے اوپر کلمہ چھپواتے تھے تاکہ مسلم بادشاہ راضی ہو جائے، انگلینڈ کے برٹش میوزیم میں وہ سکّے موجود ہیں جو

انگریزوں نے ہارون رشید اور مامون رشید کو خوش کرنے کے لئے کلمے کے ساتھ ڈھالے تھے تاکہ وہ بادشاہ خوش ہوجائیں۔ ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تُو نے
وہ کیا گردوں تھا جس کا ہے تُو اِک ٹوٹا ہوا تارا

یورپ کی تاریخ صرف پانچ سو سال کی ہے اور آپ کی تاریخ پندرہ سو سال کی ہے، آپ نے اپنی تاریخ کیوں فراموش کردی؟ پوری دنیا کو یورپ نے فتح کیا، چاہے جاپان ہو، چاہے ہندوستان ہو، چاہے امریکہ ہو، لیکن مسلمان قوم ایسی ہے جس نے یورپ کو بھی روندا ہے۔

اسپین جو یورپ کا بہت بڑا ملک ہے، انگلینڈ سے بڑا ملک ہے، جرمنی سے بڑا ملک ہے آپ نے دیکھا؟ آپ اس کا ایریا دیکھئے اور اس کی پیداوار دیکھئے جو اُس زمانے میں تھی۔ پچاس سال لگ گئے، بادشاہوں کا محل کھودنے میں یہ حال تھا! تو آپ کو اپنی قومی تاریخ معلوم ہے؟ پوری دنیا پر یورپ نے حکومت کی، یورپ پر نہ جاپانیوں نے حکومت کی نہ CHINA نے حکومت کی، نہ ہندوستان نے حکومت کی، کسی قوم نے حکومت نہیں کی، صرف آپ کی قوم ایسی تھی، کہ جس نے یورپ کو روندا اور سات سو سال تک وہاں حکومت کی۔ ؎

اے گلستانِ اندلس! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

ہندوستان میں مسلمانوں کی تابناک تاریخ اور اُن کی عظیم الشان یادگاریں

اور ہم کہتے ہیں اپنے نوجوانوں سے تم کو کچھ یاد نہ ہو تو تاج محل دیکھ لیا کرو، لال قلعہ دیکھ لیا کرو، دہلی کی جامع مسجد دیکھ لیا کرو، قطب مینار دیکھ لیا کرو، یہ تاج محل اور یہ لال قلعہ کیا بتاتے ہیں؟ اس کے بنانے والے جاہل تھے؟ اس کے بنانے والے پسماندہ تھے؟ اس کے بنانے والے محکوم تھے؟ محکوم ایسی عمارت بناتے ہیں جو دنیا کے عجائبات میں شمار ہو؟ بل کلنٹن دو مرتبہ جس کو امریکہ کا صدر رہنے کا موقع ملا وہ آکر تاج محل کے دروازے پر کھڑا ہوگیا اور اس نے یہ تاریخی بات کہی کہ ''آج میں بھی اُن خوش نصیبوں میں شامل ہوگیا، جنہوں نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کا یہ ساتواں عجوبہ دیکھا ہے''۔ تو میں یہ

عرض کر رہا ہوں کہ یہ تو دو سو تین سو سال پہلے تاج محل بنایا گیا ہے، تین سو سال پہلے آپ کی تاریخ یہ تھی۔ تو حالات نے غبار بیچ میں پیدا کر دیا ہے، پردے لٹکا دیئے ہیں، پردے ہٹاؤ تو تاریخی حقیقت آپ کو نظر آئے گی، تعلیم سے آپ کا جو رشتہ تھا، آپ کو معلوم ہے؟ یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر اور بڑے بڑے تبصرہ نگاروں نے کیا کہا؟ کہ اگر مسلمانوں کی اندلس میں حکومت نہ ہوتی تو یورپ کی ترقی سو سال پیچھے ہو جاتی اور بعض لوگوں نے کہا، پانچ سو سال پیچھے ہو جاتی۔ یہ سب مسلمان جو یورپ میں برباد کئے گئے، ان کے سائنس داں اور ان کے پڑھے لکھے اطباء اور ان کے سب جتنے بڑے بڑے اہلِ علم تھے، ان کو یورپ نے خرید لیا، کیونکہ دماغ تو پیسے سے خریدے جاتے ہیں، انہوں نے خرید لیا اور ان کی بنیاد پر انہوں نے ترقی کی تو اس لئے میرے بھائیو! احساس کمتری کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے لیکن آپ تیار تو ہوں۔ ؎

راہ خود بڑھ کے بتاتی ہے نشانِ منزل
چلنے والا بھی تو ہو گردشِ ایام کے ساتھ

کامیابی کے لئے جد و جہد شرطِ اول ہے

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. جو لوگ کوشش کرتے ہیں، راستہ اُن کو ملتا ہے اور جو راستے پر آتے ہی نہیں، گھر پڑے رہتے ہیں اُن کو راستہ نہیں ملتا، ایسا آدمی ٹھوکریں کھاتا ہے۔

ایکسیڈنٹ کا کیا مطلب ہے؟ کہ آدمی آیا، اس نے زندگی کا ثبوت دیا، اس نے حرکت کی وہ چلا پھرا ایکسیڈنٹ ہو گیا جو معذور ہیں، جو اپاہج ہیں، جو لُنجے ہیں، ان کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا کیونکہ وہ زندگی کا مظاہرہ ہی نہیں کرتے۔ ؎

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

تو اس لئے میرے عزیزو! ؎

اللہ کی رہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اُس راہ پر چلنا چھوڑ دیا

حضرت عبدالرحمٰن بن قاسمؒ کی داستانِ تحصیلِ علم

مسلمانوں کو تعلیم سے اتنی دلچسپی تھی! آج ہمارا جہالت سے وہ رشتہ ہے جو چولی اور دامن کا ہوتا ہے، چولی دامن سے الگ نہیں ہوتی، دامن چولی سے الگ نہیں ہوتا، آج یہ ہے اور پہلے کیا تھا؟ تعلیم سے مسلمانوں کا وہ رشتہ تھا جو چولی اور دامن کا ہوتا ہے، اولاد کی محبت قربان کردی، بیوی کی محبت قربان کردی اور ایک ملک نہیں پانچ پانچ ملکوں میں علم حاصل کیا، یہ تھا مسلمانوں کے اندر تعلیم کا ولولہ، امام مالکؒ مسجد نبوی میں پڑھا رہے ہیں، مسجد نبوی میں ہمیشہ بڑے بڑے علماء پڑھاتے تھے، آج بھی آپ جائیں، تو مغرب کے بعد درس ہوتا ہے اور بڑے بڑے علماء پڑھاتے ہیں۔ امام مالکؒ پڑھا رہے تھے تو ایک سترہ سال کا مصری نوجوان آیا، اُس نے امام مالکؒ کو سلام کیا اور پوچھا أفيكم عبد الرحمن بن قاسم. آپ کی مجلس میں عبدالرحمٰن بن قاسم ہیں؟ تو امام مالکؒ نے ان کی طرف اشارہ کیا، عبدالرحمٰن بن قاسم ان کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، وہ نوجوان گیا اور اُس نے ان کی آنکھوں کو بوسہ دیا، اس کے بعد کان میں کچھ کہہ دیا، بس کان میں کچھ کہنا تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہوگئی، امام مالکؒ سمجھے کہ یہ ان کے وطن سے آیا ہے کسی حادثے کی خبر لے کر تو امام مالکؒ نے فرمایا عبدالرحمٰن کیا بات ہے؟ کہنے لگے حضرت! عجیب بات ہے۔ ؎

سکوت آمیز طولِ داستانِ درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منھ میں اور تابِ سخن بھی ہے

ہماری داستان عجیب وغریب ہے نہ پوچھئے! آپ نے فرمایا ارے بتاؤ! کیا معاملہ ہے؟ کہا حضرت میں مصر کا رہنے والا ہوں اور سترہ سال سے میں آپ کی خدمت میں ہوں، حضرت امام مالکؒ کی باندی ان کو يَا عَبْدَ مَالِكٍ کہتی تھی، اے مالک کے غلام کیونکہ اس کے تصور سے یہ بات بالاتر تھی کہ غلام کے سوا سترہ سال تک امام مالکؒ کی چوکھٹ پر کون رہ سکتا ہے، طالب علم ایک سال رہا، دوسال رہا، یہ تو سترہ سال سے صبح کو آتا ہے اور شام کو جاتا ہے تو وہ يَا عَبْدَ مَالِكٍ کہتی تھی تو سترہ سال سے میں آپ کی خدمت میں ہوں، مصر کا رہنے والا ہوں، میں جب وہاں مصر میں تھا تو میں نے آپ کی کتاب پڑھ لی تھی۔ مؤطا امام مالک۔ لیکن مجھے بے چینی تھی کہ مصنف زندہ ہے اور ہم دوسرے سے سبق لے رہے ہیں، ارے مصر سے جاتے ہیں، مصنف سے پڑھنے، لیکن بیوی تھی اور

اُس کے پیٹ میں حمل تھا، تو اِن دونوں کا خیال مجھے مانع ہوتا تھا ایک دن رات کو میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا، تو میری بیوی تو رفیقۂ حیات تھی، چوبیس گھنٹے کی ساتھی تھی، اس نے دیکھا کہ کروٹیں بدل رہے ہیں تو پوچھا کہ کیوں کروٹیں بدل رہے ہو؟ میں نے کہا جو کروٹیں بدل رہا ہوں، جو بے چینی ہے اس کا علاج تمہارے ہاتھ میں ہے، کہا کیا؟ میں نے کہا میں امام مالکؒ سے پڑھنا چاہتا ہوں اور امام مالکؒ تو مدینے میں رہتے ہیں تو اس نے کہا پھر کیوں نہیں جاتے ہو، میں نے کہا تمہارے خیال سے کہ تمہارے نان نفقے کی ذمہ داری میں نے لی ہے، وہ مؤمنہ تھی اس نے کہا: ارے حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؓ کو چھوڑ گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے چٹیل میدان میں ان کے لئے انتظام کیا تھا، اللہ ہم کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا، آپ جایئے! میں چلا آیا ایک سال رہا دو سال رہا تین سال رہا۔ مَنْهُوْمَانِ لَایَشْبَعَانِ۔ دو پیاسے ایسے ہیں جو کبھی سیر نہیں ہوتے، ایک علم کا پیاسا، ایک مال کا پیاسا، میں نے سوچا کہ ابھی میری خامی دور نہیں ہوئی ہے اور رہنا ہے تو قافلہ حاجیوں کا مصر واپس جا رہا تھا، تو میں نے خط لکھا اپنی بیوی کو کہ محترمہ! معاف کرنا، میں نے تمہاری حق تلفی کی، میرا ارادہ یہاں اور رہنے کا ہے، میں تم کو اختیار دیتا ہوں، چاہو تو میرے نکاح میں رہو اور چاہو تو کسی دوسرے شخص سے نکاح کرلو، اُس کا نہایت حوصلہ افزا جواب آیا کہ آپ مدت العمر طالب علمی میں رہیں تو بھی مجھے آپ ہی کی زوجیت میں رہنا ہے، اگر خدانخواستہ آپ فوت بھی ہو گئے تو مجھے شکوہ نہیں ہوگا بلکہ اطمینان ہوگا کہ میرا رفیقِ زندگی علم کی راہ میں قربان ہوگیا، جب ایسا جواب آیا تو میں پورے انہماک کے ساتھ تعلیم میں مصروف ہوگیا، یہاں تک کہ سترہ سال اِسی حالت میں گذر گئے، اے نوجوانو سنو! یہ وہ قوم ہے جس سے تمہارا سلسلہ جُڑا ہوا ہے ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تونے
وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا

اِس مدت میں بچہ ماں کے پیٹ سے ماں کی گود میں آیا، اس کا زمانۂ شیر خوارگی گذرا، بچپن بیتا، بالغ ہوا اور پھر کمایا، یہاں تک کہ اس پر حج فرض ہوا تو جب حج کو آنے لگا تو اس کی ماں نے کہا بیٹا! جب مدینے جاؤ گے تو تمہارے ابا امام مالکؒ کے یہاں مجلس میں ملیں گے، ان کی خیریت لے کے آنا، ان سے دعائیں لینا یہ سترہ سال کا بچھڑا ہوا لختِ جگر ہے جو پہلی دفعہ ملا ہے۔ ع

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رُلائے کیوں

یہ کوئی پتھر کا ٹکڑا تو نہیں یہ گوشت پوست اور جذبات کا ٹکڑا ہے۔

تو امام مالکؒ اور پوری مجلس رونے لگی، یہ تھی علم سے دلچسپی کہ بیوی اور بیٹے کی محبت کو بھی قربان کر دیا جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

میرے اشک جن کو گہر کہیں تیری رہ گذر میں بکھر گئے
میری کائنات لُٹی سہی، تیری رہ گذر تو سنور گئی

یعنی اے محبوب! تیرے راستے میں میں نے آنسو بکھیر دیئے، یہ آنسو جو موتی کا درجہ رکھتے ہیں، میں نے تیرے راستے میں موتی سمجھ کے بکھیر دیئے، تو اگر بیٹے اور بیوی کی محبت کی ضرورت پڑی تو اس کو بھی قربان کر دیا۔

عبد الرحمٰن فروخؒ کا سبق آموز واقعہ

آپ کو معلوم ہے؟ ایک فاتح تھا عبد الرحمٰن فروخ اُس نے ترکی میں جھنڈے گاڑے تھے، حضرت ربیع بن زیادؓ صحابیٔ رسول تھے، ترکی کے یہ فاتح ان کے غلام تھے، بیس پچیس سال کی عمر تھی اِن کی، تو جب ترکی میں جھنڈے گڑ گئے تو چونکہ حضرت ربیع ابن زیادؓ نے نذر مانی تھی کہ میری زندگی کی آخری آرزو یہ ہے کہ میں ترکی میں جھنڈے گاڑ دوں، ہمارے نوجوانوں کی آرزو کہاں ہے؟ ہمارے نوجوانوں میں اولوالعزمی ہے؟ ہمارے نوجوانوں میں بلند خیالی ہے؟ ہرگز نہیں! ہمارے نوجوانوں میں تو صرف خواہشات رہ گئی ہیں کہ مچھلی کھاؤ اور بریانی کھاؤ، تو ان کی بلندیاں کیا تھیں؟ ان کے خیالات دوسرے تھے، ان کا عالم ہی دوسرا تھا۔ ؎

پرواز ہے دونوں کی اِسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

صحابہؓ کی جس ماحول میں پرواز تھی، وہ ماحول آپ کو نصیب ہی نہیں ہے، وہ بلندی نصیب ہی نہیں ہے، اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ صحابہؓ کے گرد راہ کے برابر بھی ہم نہیں، ان کی آرزوئیں کیا تھیں؟

وہ یہ کہ ہم ترکی میں جو یورپ کا حصہ کہلاتا تھا وہاں بھی جھنڈا گاڑ دیں اور گاڑ دیا۔

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں

می دہد یزداں مرادِ متقی

ہم کچھ چاہتے ہیں اور آپ کچھ چاہتے ہیں اور اللہ اپنے نیک بندوں کی مرادیں پوری کر دیتا ہے۔ تو جب ترکی فتح ہو گیا تو حضرت ربیع بن زیادؓ دریائے جیحون کے کنارے پہنچے اور فرمایا سب لوگ وضو کریں اور سجدۂ شکر ادا کریں تو سب نے دو دو رکعت نماز پڑھی، اس کے بعد حضرت بیٹھ گئے، چاندی اور سونے کا ڈھیر لگا دیا گیا، دونوں ہاتھ بھر بھر کے غازیوں کو دیا، سب سے زیادہ اپنے غلام فروخ کو دیا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے اپنی آنکھوں سے کہ یہ کس طرح مجمع میں گھس جاتا تھا، تو تیس ہزار اشرفیاں سونے کی دیں اور کہا بیٹا! تم نے اسلام کے لئے اتنی قربانی دی ہے، اب میں تم کو غلام نہیں رکھوں گا، جاؤ تم آزاد ہو، تم نوجوان ہو، شادی کرو، گھر بساؤ، تو آج کل تو لوگ انگلینڈ اور امریکہ کی سوچتے ہیں، اُس زمانے میں لوگ مکے اور مدینے کے سوا کچھ سوچتے نہیں تھے، تو انہوں نے سوچا کہ مدینے میں چلیں، وہاں گنبدِ خضرا کے سائے میں ایک مکان بنالیں، چنانچہ گئے اور ایک مکان لے لیا اور ایک نیک خاتون سے نکاح کر لیا، دونوں میاں بیوی رہنے لگے ایک دو سال گذرے تھے، مسجد نبوی میں نماز پڑھنے گئے تو امام صاحب نے اعلان کیا کہ فلاں محاذ کے اوپر مجاہدین کی ضرورت ہے، آپ لوگ رضا کارانہ طریقے پر نام لکھوالیں یعنی ڈنڈے کے زور پر نہیں، خوشی سے۔ اُس زمانے میں لوگ خوشی سے نکلتے تھے کوئی رجسٹر نہیں ہوتا تھا نہ کوئی سپاہی اور پیادے ہوتے تھے، سب لوگوں نے نام لکھوائے، سب سے آگے ہی بڑھ گئے عبدالرحمٰن فروخ، کیونکہ پہلوان جو کشتی لڑتا ہے وہ لنگوٹ اُتار بھی دے اور کسی نامی گرامی کشتی کا اعلان ہو جائے تو پہلوانی کا شوق چٹکی لیتا ہے کہ لاؤ ہم بھی لڑیں، دو دو ہاتھ کریں۔ تو دو سال گذر چکے تھے، نیزے اور تیروں کی بارش اور تلواروں کے کھنکنے اور گھوڑوں کے ہنہنانے اور غبارِ جنگ کے، کہ اسی کی عادت تھی، موقع آیا تو شوقِ جہاد چرّایا، آگے بڑھ کے نام لکھایا اور گھر آئے، تو بیوی سے کہا میں جہاد میں جا رہا ہوں، بیوی نے کہا ولمن تترکني وتترك هذا الجنين؟۔ جہاد میں جا رہے ہیں شوق سے جایئے، ہم کو کس پر چھوڑ کر جا رہے

ہیں اور ہمارے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو کس پر چھوڑ کے جا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا۔ أتر كُكِ للّٰہِ ورَسُولہٖ۔ میں تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ جہاں تک خرچے کی بات ہے تو یہ لو تیس ہزار اشرفیاں اِنہیں خرچ کرنا، جو بچ جائے، ان کا حساب دے دینا، تو بیوی مطمئن ہوگئی اور وہ جہاد میں چلے گئے، ایک سال گذرے دو سال گذرے، تین سال گذرے، پتہ ہی نہیں چلا، تو عورتوں کی عادت ہوتی ہے، تاریک پہلو میں جانے کی، مایوسی اُن کی فطرت میں ہوتی ہے، انہوں نے کہا ہو نہ ہو میرا شوہر اللہ کے راستے میں کام آ گیا، سینے پر پتھر رکھ کر صبر کرلیا، چار چھ مہینے کے بعد بچہ پیدا ہوا جو پیٹ میں تھا وہ گود میں آ گیا، شوہر کی امانت و یادگار سمجھ کر سینے سے لگایا، اُس کا نام ربیعہ رکھا اور اس کی پرورش کرتی رہی، بچہ تھا ہوشیار! ے

بالائے سرش زہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

حضرت امام ربیعہؒ کی علمی تشنگی اور تحصیلِ علم کی خاطر مختلف ملکوں کا سفر

اس کی پیشانی سے پتہ چلتا تھا کہ اس کا مستقبل بڑا روشن اور تابناک ہوگا ”ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات“، اب ماں نے تھیلی کھول دی، بچے کے لئے اشرفیاں لیں دس بیس اور بچے کی انگلی پکڑی اور مسجدِ نبوی میں جو سب سے بڑا عالم تھا اس کی خدمت میں لے گئیں، پہلے نذرانہ پیش کیا اور کہا یہ میرا بیٹا آپ کی خدمت میں ہے تو استاذ نے گھول کے پلا دیا، انہوں نے ایک تو ماں کی طرف سے یہ خدمت دیکھی اور دوسرے لڑکے کی ذہانت! خوب پڑھا دیا، اس کے بعد بیٹے نے اماں سے کہا کہ اماں! اب مسجدِ قبا میں جو علماء آتے ہیں ان سے پڑھیں گے، تو مسجدِ قبا میں پڑھنے لگے، پھر کہنے لگے اماں! اب ہم یمن جائیں گے تو یمن میں اپنے پیسے سے بھیجا، پھر کہا مکہ جائیں گے تو مکے بھیجا، کہا، ملک شام جائیں گے، ملک شام بھیج دیا، پھر کہا مصر جائیں گے، تو مصر بھیجا، اپنے پیسے سے ساتھیوں کا قافلہ روانہ کیا، پانچ پانچ ملکوں سے جو پڑھ کے آئے وہ تو سورج اور چاند کی طرح مشہور ہو جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے، اتنا بڑا وہ عالم تھا اس کا نام تھا ربیعہ، دیکھا آپ نے! یہ تھی تعلیم سے دلچسپی! نو جوانوں کو بتا رہا ہوں، دو

تین شہر میں اگر ہمارے نوجوان پڑھ آئیں، دہلی میں پڑھ آئیں اور بمبئی میں پڑھ آئیں تو سمجھتے ہیں ''ہمچوں من دیگرے نیست''۔ ہم بڑے تیس مار خاں ہیں، ارے تمہارے آباء واجداد تین چار شہروں میں نہیں، پانچ پانچ ملکوں میں پڑھتے تھے تب بھی ان کے علم کی تشنگی ختم نہیں ہوتی تھی۔ ؎

ہر اِک میکدے سے بھرا جاکے ساغر
ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہوکر
گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر
گرہ میں لیا باندھ قولِ پیمبر
کہ حکمت کو اک گم شدہ لعل سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

حضرت امام ربیعہؒ کے دو عظیم شاگرد

تو امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ حضرت ربیعہؒ سے پڑھ رہے تھے، تیس سال کے بعد ایک واقعہ پیش آیا، اب ربیعہؒ تیس سال کے ہو گئے تھے اور مسجد نبوی میں پڑھا رہے تھے، تیس سال کے بعد یہ واقعہ پیش آیا، عشاء کی نماز ہو چکی ہے، دروازے کھلے ہوئے ہیں، کیونکہ نمازی مسجد سے اپنے گھر آرہے ہیں، ایک بڑے میاں جن کی عمر ساٹھ سال کی ہے گھوڑے پر سوار ہاتھ میں نیزہ لئے ہوئے آرہے ہیں، پوچھا عبدالرحمٰن فروخ کا مکان کہاں ہے، تو کون بتائے؟ دس سال میں تو بستی کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے اور یہ تو تیس سال کے بعد آئے ہیں تو خود ہی اپنے حافظے پر زور ڈال کر اپنے مکان کی حدود اربعہ کو دیکھا اور ایک مکان کے سامنے جس کے بارے میں دل نے شہادت دی کہ ہونہ ہو یہی میرا مکان ہے اتر گئے اور اترتے ہی گھوڑے کو کنڈی میں باندھ دیا اور اندر دندناتے ہوئے چلے گئے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ یہ میرا گھر ہے جیسے اندر پہنچے ویسے ہی تیس سال کا کڑیل جوان دوڑتا ہوا آیا اور ہاتھ کا گٹا پکڑ لیا اور کہا یا عدو اللہ تدخل بیتنا بغیر اذن. اے اللہ کے دشمن! ہمارے گھر میں بلا اجازت گھسا چلا آتا ہے، تو بڑے میاں کہنے لگے یہ ہمارا گھر ہے اور ربیعہ کہہ رہے تھے کہ یہ ہمارا گھر ہے، اب آپ خود خیال کیجئے! دس گیارہ بجے رات کے سناٹے میں جب آواز بلند ہوتی ہے تو آدھا مدینہ گونج

جاتا ہے، شور سن کر امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ اور محلے کے کچھ لوگ بے تحاشا بھاگتے ہوئے آتے ہیں کہ ہمارے استاذ سے کون الجھ گیا ہے، دیکھا تو ایک بڑے میاں ہیں، دونوں ایک دوسرے کا گریبان پکڑے ہوئے ہیں، تو امام مالکؒ نے کہا کہ بڑے میاں! مکان تو اِن ہی کا ہے، اگر آپ کو اصرار ہے تو صبح طے کر لیجئے گا، ہمارا غریب خانہ حاضر ہے، رات کو ہمارے یہاں قیام کریں، تو انہیں سات آٹھ آدمیوں کی بات ماننی پڑتی ہے، سر جھکا کر جانے لگتے ہیں لیکن گھر سے باہر ہونے سے پہلے انہوں نے سر آسمان کی طرف اٹھایا اور گنبدِ خضرا پر نظر ڈالی اور کہا اے اللہ! تیرے نبی کے شہر میں یہ ظلم؟ ارے کوئی نہیں جانتا، تُو تو جانتا ہے کہ یہ مکان عبدالرحمٰن فروخ کے اِن ہاتھوں نے بنایا ہے اور آج عبدالرحمٰن فروخ کو اُسی کے مکان سے بے دخل کیا جارہا ہے، تو بیوی بالاخانے پر سو رہی تھی جب عبدالرحمٰن نام سنا تو اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو کلّے ٹھلّے سے پہچان گئی کہ یہ تو میرے شوہرِ نامدار ہیں جو تیس سال بعد واپس آئے ہیں تو سب سے پہلے اس نے پڑوسیوں کو واپس کیا کہ إنصرفوا عنه يا قوم بارك الله عليكم. بھائیو! آپ لوگ جائیے یہ باپ بیٹے کا معاملہ ہے، کوئی دشمنوں کا معاملہ نہیں ہے، تو سب لوگ خوشی خوشی چلے گئے، اس کے بعد اس نے بیٹے سے کہا: دَعْهُ يا ربيعة فإنه ابوك. ربیعہ انہیں چھوڑ دو تم نے اپنے باپ کا گریبان پکڑ رکھا ہے؟ اور اپنے شوہر سے کہا حَذَارِ يا أبا عبدالرحمن فانه ولدك. عبدالرحمٰن انہیں چھوڑ دو آپ نے اپنے بیٹے کا گریبان پکڑ رکھا ہے؟ وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھوڑی تھے۔ عبدالرحمٰن صرف اتنا جانتے تھے کہ جب میں جا رہا تھا تو میری بیوی حمل سے تھی اور ربیعہ جب سے پیدا ہوئے تب سے انہوں نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا کہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے، خوب گلے ملے اور روتے رہے بارہ اسی میں بج گئے، اس کے بعد فروخ اپنی بیوی کے پاس آئے اور داستان سنانی شروع کر دی تیس سال کی، کہ کچھ نہ پوچھو پہلا شہر میں نے فتح کیا، اس کے دریا کا پانی ایسا تھا اور وہاں کے پھل ایسے تھے۔ ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

حکایت مزے دار تھی لمبی بیان کی اور بیوی کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ وہ تیس ہزار اشرفیوں کا حساب لینے نہ بیٹھ جائیں کیونکہ تیس ہزار اشرفیاں تو تعلیم پہ خرچ کر دیں اس نے، آخر کار وہی ہوا کہنے لگے وہ تیس ہزار اشرفیاں جو ہم تمہیں دے گئے تھے، اس میں سے کچھ بچی ہوں تو لاؤ، کچھ ہمارے پاس

بھی ہے، بڑھاپے میں کوئی جائیداد خریدیں گے تو اس سے بڑھاپا پار ہو جائے گا، اتنے میں مؤذن نے کہا: الصلوۃ خیر من النوم۔ یعنی فجر کی اذان ہوگئی، کیونکہ رات تھوڑی رہ گئی تھی، اذان ہوگئی، تو بیوی نے کہا ارے آپ کو حساب کی جلدی پڑی ہے، جایئے وضو کرکے مسجد نبوی میں باجماعت نماز پڑھیے تو انہوں نے جلدی جلدی وضو کیا اور نماز کے لئے جانے لگے تو پوچھا ربیعہ کہاں ہیں؟ بیوی نے کہا ربیعہ جا چکے، خیر نماز پڑھی، اس کے بعد روضۂ اقدس پر سلام پیش کیا۔

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

پھر دیکھتے کیا ہیں کہ ہزاروں لڑکے مسجد میں جمع ہو گئے اور ایک آدمی بلبل کی طرح چوکی پر بیٹھ کر چہکنے لگا جیسے پروانے گرتے ہیں شمع پر، اسی طرح اُس نوجوان پر شہزادے اور وزیرزادے سب کے سب قربان ہیں، کوئی جوتی اٹھانے کے شوق میں لگا ہوا ہے، کوئی شملہ سنبھال رہا ہے تو ان کے منہ میں پانی آ گیا کہ ارے تیس سال تک میں میدانِ جنگ میں ہتھیلی پر سر رکھ کر کے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے پھرا لیکن جب مدینے میں آیا تو کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی؟ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اور یہ نوجوان ہے، اس کی اتنی عزت؟۔ بوڑھی آنکھیں اور فجر کا وقت ڈھندلا سا اور چھت کے نیچے، پہچان نہیں پائے کہ یہ کون لڑکا ہے اور پھر رات کو اگر دیکھا بھی تھا تو کرتے پائجامے میں دیکھا تھا سر پر عمامہ نہیں تھا، عبا وقبا نہیں تھی، اب تو سر پر عمامہ بھی تھا اور عبا اور قبا بھی، رات کو انہوں نے پہچاننے میں دھوکا کھایا۔ سوچا کہ لاؤ اِس بلبلِ ہزار داستان کی کچھ بات ہم بھی سنیں تو کنارے بیٹھ گئے تو جب وہ حدیث کی تشریح کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کانوں میں رَس گھول رہے ہیں اور طالبانِ علوم نبوت شیخِ مجلس کے منھ سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو بہت توجہ سے لکھتے جا رہے ہیں جیسے موتی چُن رہے ہوں، اور لوگ خاموشی کے ساتھ شیخ کی زبان سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو اِس توجہ اور انہماک سے سن رہے تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں تو میں نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ بیٹا یہ کون صاحب ہیں؟ تو اس نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا درس میں خلل ڈال رہے ہو؟ ان کا نام ہے ربیعہ آپ اِن کو نہیں جانتے؟ یہ سورج اور چاند کی طرح پوری دنیا میں مشہور ہیں، انہوں نے کہا کہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں، اس لڑکے نے کہا، ہاں میں سمجھ گیا کہ آپ یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں، ان کا نام ہے ربیعہ، ان کے باپ کا نام عبدالرحمٰن ہے۔ ان کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ یہ میرا بیٹا ہو سکتا

ہے سوچا مدینے میں عبداللہ اور عبدالرحمٰن تو ہوتے ہی ہیں، اس کے بعد کہا کون عبدالرحمٰن؟ اس لڑکے نے کہا آپ برابر سوال کرتے جارہے ہیں، اب آپ کا یہ آخری سوال ہے۔ ہم عبدالرحمٰن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے، جب ہم مسجد میں نماز پڑھنے آئے تھے تو ہمارے کچھ ساتھی کانا پھوسی کررہے تھے کہ حضرت کے والد بہت دنوں کے بعد رات کو آئے ہیں، اب انہیں یقین ہوگیا کہ یہ تو میرے گھر کا چراغ ہے، یہ اللہ نے مجھ کو نعمت عطا فرمائی ہے تو مارے خوشی کے آنکھوں میں آنسو آگئے، جب آنسو آگئے تو سوچا یہاں سے چلنا چاہئے ورنہ تماشہ بن جائیں گے، جوتے اٹھائے اور چل دیئے، دو قدم پر مکان تھا جیسے چوکھٹ پر قدم رکھا، بیوی نے تاڑ لیا، بیوی بھی بہت ذہین تھی کہا: ما بك يا أبا ربيعة؟ عبدالرحمٰن کیا بات ہے؟ کہا ما بي الا الخير۔ سب ٹھیک ہے! بیوی نے کہا نہیں! کچھ تو ہے، تمہاری آنکھوں میں یہ بڑے بڑے آنسو کیسے ہیں؟ کہنے لگے ارے یہ رنج کے آنسو نہیں ہیں، یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ لقد رفع الله ابني۔ اللہ نے میرے بیٹے کو بہت اونچا مقام عطا کیا ہے۔

تیس ہزار اشرفیاں زیادہ قیمتی ہیں یا بیٹے کا یہ مقامِ بلند

تب بیوی نے کہا أَيُّما أَحَبُّ اليك۔ آپ کی نظر میں زیادہ قیمت کس کی ہے؟ ثلاثون ألف دينار أم هذا الذي بلغه ولدك من العلم والشرف؟ تیس ہزار اشرفیوں کی قیمت زیادہ ہے یا یہ رتبہ جو تمہارے بیٹے کو ملا؟ کہنے لگے ارے تُو پاگل اور دیوانی ہوگئی ہے! جو رتبہ میرے بیٹے کو حاصل ہے، بادشاہوں کی تجوریاں بھی اس کو حاصل نہیں کرسکتیں، میرا بیٹا تو انمول ہیرا اور انمول موتی ہے، تب بیوی نے کہا بندہ نواز! وہ تیس ہزار اشرفیاں جن کے حساب کی آپ کو جلدی تھی وہ آپ کے بیٹے کی تعلیم پر میں نے صرف کردیں، تو اتنے خوش ہوئے عبدالرحمٰن کہ جیسے مور ساون اور بھادوں میں خوش ہوتا اور ناچتا ہے جب ہلکی پھوار پڑتی ہے۔ ان کی زبان پر تھا۔ واللّٰهِ ما ضيّعتهٖ، واللّٰهِ ما ضيّعتهٖ، واللّٰهِ ما ضيّعتهٖ۔ اگر تم نے یہ تیس ہزار اشرفیاں ربیعہ کی تعلیم پر خرچ کی ہیں، تو خدا کی قسم تم نے ضائع نہیں کیا، خدا کی قسم تم نے ضائع نہیں کیا، خدا کی قسم تم نے ضائع نہیں کیا، فجزاكِ اللّٰهُ عن الاسلام والمسلمين خيراً۔ اللہ تم کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے! تو بھائیو! یہ تھی دلچسپی تعلیم سے مسلمانوں کی، آج آپ پوچھئے! ؎

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

وہ مائیں عظیم تھیں جو اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت پر سب کچھ قربان کر دیتی تھیں

تم موت کا انتظار کر رہے ہو، یہ تھے تمہارے آباء واجداد۔ وہ تو سونے کے سکے تھے اگر تانبے کے سکے ہوں تو آج ہماری عورتیں خرچ کرنے میں کنجوسی کریں گی اور اگر چاندی کے ہوں تو بہت مشکل ہے اور سونے کے ہوں تو ناممکن ہے، چاہے جتنی پڑھی لکھی عورت ہو، اب بھی دنیا کے اندر تعلیم سے وہ شیفتگی اور دلچسپی نہیں پیدا ہوئی جو مسلمان عورتوں کے اندر ایک ہزار سال پہلے تھی کہ سونے کے سکے اس طرح لٹاتی تھیں اپنے بچوں کی تعلیم کے اوپر جیسے پانی بہایا جاتا ہے، تو دوستو! میں اپنے نوجوانوں سے کہہ رہا ہوں، اپنے بھائیوں سے کہہ رہا ہوں، یہ ہمارے لختِ جگر ہیں، یہ ہمارے دیدۂ ودل ہیں بچے۔ ؎

نعمت نہیں دنیا میں پسر سے کوئی بڑھ کر
راحت نہیں آرامِ جگر سے کوئی بڑھ کر
لذت نہیں پاکیزہ ثمر سے کوئی بڑھ کر
نکہت نہیں بوئے گلِ تر سے کوئی بڑھ کر
صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی رَوح یہی رُوح یہی ہے
ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اِسی سے
وہ گل ہے کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اِسی سے
سب راحت وآرام کا ساماں ہے اِسی سے
آبادیٔ کاشانۂ انساں ہے اِسی سے
کس طرح کِھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں آپ ﷺ کے ارشاداتِ گرامی

اپنے فرزندِ ارجمند کی تعلیم اور اپنی دختر نیک اختر کی تعلیم کے سلسلہ میں اگر آپ نے بخل سے کام لیا، تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اولاد کی محبت میں آپ جھوٹے ہیں، آپ مسخرہ پن کر رہے ہیں، آپ مگر مچھ کے آنسو بہار ہے ہیں، جو ہولٹادو، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: من عال جاريتين حتى تبلغا جاء يوم القيامة أنا وهو كهاتين۔ اگر دو بچیوں کی اچھی تربیت کوئی کرے، پڑھائے لکھائے، تو قیامت کے دن میرا اور اس کا درجہ اتنا قریب ہوگا جیسے یہ دونوں انگلیاں (انگشت شہادت اور درمیانی انگلی) اتنا قریب ہوگا، بچوں کی پرورش کرنے والا۔ اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ما نَحَلَ والد ولده مِن نحل أفضلَ من أدب حسنٍ۔ تعلیم وتربیت سے بڑھ کر اولاد کو کوئی تحفہ نہیں دیا جاسکتا، آپ اگر چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے عزت پائیں تو عزت بغیر تعلیم کے نہیں پاسکتے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے صحت مندر ہیں تو تعلیم ہی سے صحت مند رہ سکتے ہیں، ہسپتالوں میں دیکھو، بیماروں کی اکثریت جاہلوں کی ملے گی، پڑھے لکھوں کی تعداد بہت کم ملے گی ہسپتالوں میں، کیونکہ تعلیم صحت عطا کرتی ہے، عزت تعلیم سے ملتی ہے، جو چیز عزت کی ضامن ہو، صحت کی ضامن ہو، ترقی کی ضامن ہو، اس سے ہم پیچھے ہٹتے ہیں، اس سے ہم مٹھی بند کرتے ہیں، اس لئے کہ ہم دانت سے پیسے کو پکڑتے ہیں تو یہ ہماری ترقی اچھی نہیں ہے۔ ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤگے اے ہندی مسلمانو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اچھے کاموں پر بچوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے

اس لئے اللہ ہمیں توفیق عطا فرمائے حوصلہ افزائی کرنے کی۔ بہر حال تربیت نہ ہونے کا قصور بھی آپ قبول کر لیجئے! حضرت عمرؓ بچوں میں جب کوئی اچھی چیز دیکھتے تھے تو حوصلہ افزائی کرتے تھے، ہمارے یہاں کیا ہے؟ بچہ کچھ چُرا کر لائے تو اس کی پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے، جیسے جب سلطانہ ڈاکو کو پھانسی دی جارہی تھی تو اس نے کہا، میری ماں کو بھی پھانسی کی سزادو، کیونکہ جب سب سے پہلے میں نے چوری کی تھی تو میری ماں نے میری پیٹھ تھپتھپائی تھی، تو اگر اعلیٰ درجے کا کام

کرے تو بچے کی پیٹھ تھپتھپانی چاہئے، مشہور واقعہ ہے۔ کہ ایک بار حضرت عمرؓ مدینہ منورہ میں رات کو گشت کر رہے تھے، تو آواز آئی ایک مکان سے، ایک ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ دودھ میں پانی ڈال دو، گاہکوں کے لئے دودھ کافی نہیں ہوتا ہے، گاہک رہ جاتے ہیں اور دودھ ختم ہو جاتا ہے۔ پانی ملا دو، کام چل جائے گا، تو بیٹی نے کہا کیسے دودھ میں پانی ملا دیں، امیر المؤمنین نے اعلان کیا ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملاؤ، تو جس حکم کو ہم نے ظاہر میں مان لیا اس کو ہمیں اندر سے بھی ماننا چاہئے، ماں کہنے لگی ارے! امیر المومنین یہاں دیکھ رہے ہیں، بے وقوف کہیں کی؟ کیا یہاں گھر کے اندر، کوٹھری کے اندر، اندھیرے میں رات کے وقت امیر المومنین دیکھ رہے ہیں؟ تو بیٹی نے کہا امیر المومین نہیں! امیر المومنین کے رب دیکھ رہے ہیں، تو ماں لاجواب ہوگئی، وہ خیر القرون کا زمانہ تھا، حضرت عمرؓ کے ساتھ جو غلام تھا یا کوئی اور تھا، آپؓ نے اُس سے فرمایا کہ اس مکان کو نوٹ کرو، چنانچہ نوٹ کیا گیا اُس مکان کو، صبح آپ جب سو کر اٹھے اور بیٹھے سب آئے تو حضرت نے فرمایا کہ بھائی اس کی ماں سے پوچھو کہ اس بچی کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں، پوچھا گیا تو ماں نے کہا کہ نہیں، تو آپؓ نے فرمایا کہ میں اگر اپنے ایک بیٹے سے اس کا نکاح کر دوں، تو کیسا رہے گا؟ تو ماں باغ باغ ہوگئی اور خوشی سے اچھلنے لگی، حضرت عمرؓ نے اس کا نکاح اپنے بیٹے عاصم سے پڑھا دیا، ایسی نیک لڑکی کے پیٹ سے ایسی لڑکی پیدا ہوئی جس سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ پیدا ہوئے، جنہوں نے بھیڑیئے اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی پلا دیا یعنی ظالم اور مظلوم کا فرق مٹا دیا وہ ایسا اللہ کا بندہ تھا۔ تو یہ کس وجہ سے ہوا؟ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ بچپن میں دین وایمان پر اُس لڑکی کی پرورش ہوئی تھی۔

حضرت عمرؓ اور غلام چرواہے کا ایمان افروز واقعہ

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ حج کو جا رہے تھے، آپؓ کا مزاج عجیب وغریب تھا، دو چار حضرات جو نیک اور بہت اعلیٰ درجے کے متقی اور پرہیز گار ہوتے تھے وہی حضرت کے ساتھ رہتے تھے، آج کل ایم، ایل، اے۔ ایم، پی کے ساتھ کون ہوتے ہیں؟ بے ایمان، چاپلوس، مکّار۔ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ اعلیٰ درجے کے لوگ ہوتے تھے، تو حضرت عمرؓ جب مکے کے قریب پہنچے تو پہاڑوں سے بکریاں لے کر ایک لڑکا اتر رہا تھا، لگتا تھا کہ غلام ہے تو آپؓ نے اس کا امتحان لیا اور کہا بھائی!

گوشت کھانے کی خواہش ہے، مدینے سے چلے کئی دن ہو گئے ہیں، تُو ایک بکری ہم سے بیچ دے، تو اس نے کہا کہ بکری میری نہیں ہے، میرے آقا کی ہے، میں تو غلام ہوں، میں کیسے بیچ دوں، تو فرمایا: تمہارا آقا کوئی یہاں موجود ہے؟ پیسے لو اور کہہ دینا کہ بھیڑیا آیا اور کھا گیا وہ غلام کہنے لگا۔ فأین اللہ. اور اللہ میاں کہاں گئے؟ بس حضرت عمرؓ اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے اس کے آقا کے پاس پہونچے اور اس کے آقا سے کہا یہ غلام کتنے کا ہے؟ تو اس نے منھ مانگے پیسے طلب کئے، سمجھ رہا تھا، خلیفہ لینا چاہتے ہیں، حضرت عمرؓ نے اُس کو منھ مانگا پیسہ دیا اور غلام سے کہا کہ ہم تم کو آزاد کرتے ہیں، یہ ہے ایمان کی تربیت کا وزن اور اس کی قدر و قیمت۔ ہمارے علماء کے نزدیک بھی تربیت کی بڑی اہمیت تھی اور آپ تربیت سے غافل ہیں، آپ اپنے ہیرے اور موتیوں کو تراشنے کے بجائے پتھر بنا رہے ہیں، بے قیمت کر رہے ہیں، اگر ہیرا اور موتی ہے، تب بھی اُس کو تراشنے کی ضرورت ہے، اپنی اولاد پر سخت نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

بیٹے کا حق باپ پر اُسی طرح ہے جس طرح باپ کا بیٹے پر

حضرت عمرؓ کے پاس ایک صاحب آئے، کہا میرا بیٹا، میرا نافرمان ہے، بلایا آپؓ نے بیٹے کو اور کہا تُو اپنے باپ کی نافرمانی کرتا ہے؟ تو اس نے کہا کہ کیا نافرمانی کرتے ہیں؟ تو باپ نے کہا کہ یہ مجھے گالی دیتا ہے، مارتا ہے، تو بیٹا حضرت عمرؓ کے تیور دیکھ کر ڈر گیا کہ حضرت ابھی میری خبر لیں گے، تو اُس نے عرض کیا امیر المومنین! گستاخی معاف، کچھ کہنے کی اجازت ہے؟ فرمایا کہ کہو، تو اُس نے کہا کہ باپ کا تو حق بیٹے پر ہے، ھل من حق الولد علی الوالد۔ اے امیر المومنینؓ! کیا بیٹے کا بھی کچھ حق باپ پر ہوتا ہے؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ ہاں! بیٹے نے کہا، کیا حق ہے؟ تو فرمایا کہ اس کے لئے ماں کا اچھا انتخاب کرے تا کہ وہ اچھی نسل سے پیدا ہو اور اس کا نام اچھا رکھے، اس لئے کہ جو پودا صحرا میں اُگتا ہے وہ لاوارث ہوتا ہے، اس کا کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا، اِس لئے اُس میں وہ بات نہیں ہوتی جو پھلواری میں اُگنے والے پودے میں ہوتی ہے، چنانچہ اس کی خوبصورتی، اس کے پھل کی مٹھاس اور اس کے پھول کی خوشبو اور ہی ہوتی ہے۔

ہمیشہ بڑے لوگ دیندار عورت کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں

اِسی طرح اچھے ماحول میں جو عورت ہوتی ہے، اس کے پیٹ سے جو بچہ پیدا ہوتا ہے جو نجابت

وشرافت اس میں ہوتی ہے، وہ آزاد خیال عورت کے پیٹ سے نہیں پیدا ہوتی، میں بتا رہا ہوں نوجوانو اور بیٹو! سن لو! کوئی بڑا آدمی آج تک آزاد خیال لڑکی کی گود میں نہیں پیدا ہوا، چاہے صلاح الدین ایوبیؒ ہوں، چاہے طارق ابن زیادؒ ہوں، چاہے عالمگیر اورنگ زیبؒ ہوں، چاہے محمود غزنویؒ ہوں، کوئی بڑا آدمی مسلمانوں کی تاریخ میں ایسا نہیں ہے جو کسی ایڈوانس، کسی آوارہ، کسی آزاد خیال اور شریعت سے بیگانہ اور بے دین عورت کی گود میں پیدا ہوا ہو۔ یہاں تسلیمہ نسرین ملعون ہے مسلم معاشرے میں لعنة الله عليها . اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ ہمیشہ بڑے لوگ گھر گرہست سادہ اور دیندار عورت کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں، آپ پڑھیے، صلاح الدین ایوبیؒ کو۔ تو حضرت عمرؓ سے پوچھا اُس لڑکے نے، بیٹے کا بھی کچھ حق ہے باپ پر؟ تو آپؓ نے فرمایا ہاں! اُس کے لئے اچھی ماں کا انتخاب کرے اور پیدا ہونے کے بعد اس کا نام اچھا رکھے اور اس کو قرآن کی تعلیم دے تو امیر المومنین! اب سنئے! میرا نام انہوں نے عبداللہ اور عبدالرحمٰن کے بجائے جُعَل رکھا یعنی گُبریلا اور گُبریلا کے معنیٰ اُس کیڑے کے ہیں جو گوبر میں رینگتا ہے، معمولی سا ہوتا ہے، وہ گوبر ہی میں رہتا ہے، گوبر سے ہٹا دو مر جائے گا اور میری ماں ایک حبشی عورت ہے جو کسی مجوسی کی باندی تھی، میرے باپ نے مجوسی کی باندی حبشی عورت سے نکاح کیا، اس سے میں پیدا ہوا، یہ میری ماں کا انتخاب کیا اور قرآن کا ایک حرف بھی مجھ کو نہیں سکھایا، تب حضرت عمرؓ نے کوڑا رکھ دیا اور فرمایا عـقـقـت ولدك قبل ان يعوقك۔ تُو نے اپنے بیٹے کی نافرمانی کی قبل اس کے کہ وہ تیری نافرمانی کرے، پہلے تُو نے اس کی نافرمانی کی بعد میں اگر بیٹے نے نافرمانی کی، تو اس کا کیا جرم؟ اِذَا كَانَ رَبُّ الْبَيْتِ بِالطَّبْلِ ضَارِباً فَلَا تَلُمِّ الْاَوْلَادَ عَلَى الرَّقْصِ ۔ اگر گھر کا ذمہ دار ڈھولک بجائے اور بچے ناچیں تو بچے قابلِ ملامت نہیں ہیں، گھر کا ذمہ دار قابلِ ملامت ہے، عشرت حسین مرحوم جو اکبرالہ آبادی مرحوم کے بیٹے اور سرسید مرحوم کے ہم خیال تھے، وہ اِس بات پر بہت زور دیا کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم حاصل کرو، تو اس پر اکبرالہٰ آبادی مرحوم نے فرمایا تھا ؎

عشرتی گھر کی محبت کا مزہ بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے

پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروانہ رہی
کیک کو چکھ کے سویّوں کا مزہ بھول گئے

موم کی تتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو
جب کہ بوڑھے روشِ دینِ خدا بھول گئے

آخری بات

اس لئے میرے بھائیو! تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول کرو، اللہ کے یہاں اس پر جواب دہ ہونا پڑے گا اور غفلت سے باز آ ؤ، اللہ تعالیٰ کے یہاں جب تک توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوگا اُس وقت تک بھی اگر مسلمان قوم سُدھر جائے گی تو انشاء اللہ اس کے سُدھرنے کا فائدہ اس کو پہنچے گا۔ یَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰىٓ أَنْفُسِهِمْ لَاتَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًاً۔ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور غفلت کی زندگی بسر کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ سب گناہوں کو معاف کردیں گے بشرطیکہ آنکھیں کھولو، غفلت سے توبہ کرو اور زندگی از سرِ نو شروع کرو، اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین.

۞۞۞

ہماری چند اہم مطبوعات

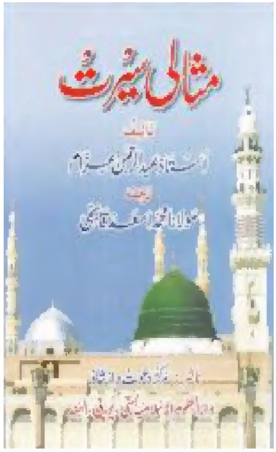

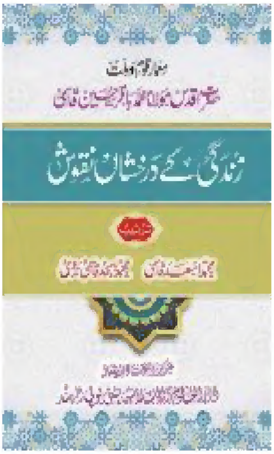

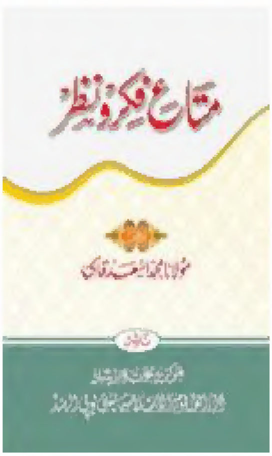

ناشر : مرکز دعوت و ارشاد

دار العلوم الاسلامیہ بستی یوپی الہند

Book Post
(Printed Book)

BI-MONTHLY
FIKR-E-ISLAMI

ایک عظیم الشان ادارہ

احقر دارالعلوم الاسلامیہ میں اکثر حاضر ہوتا رہتا ہے، اس کی خواہش تھی کہ ہمارے پورب میں ایسا ادارہ ہو جس میں اپنے اسلاف کے اصول کے مطابق تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہو، اور شروع سے لیکر آخر تک کی درسیات اس میں پڑھائی جائیں، اس کا مشورہ جناب مولانا محمد باقر حسین صاحب مدظلہٗ العالی سے ہوتا رہا۔

ہمارے اس پوربی علاقہ میں انھیں کی ایسی ذات ہے، جن کے عزم و ارادہ کے سامنے کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی، اللہ پاک نے ان کے دل کے اندر اس کا جذبہ پیدا فرمادیا اور بحمدہٖ تعالیٰ چند ہی سال میں ایسا عظیم الشان ادارہ قائم ہوگیا جس میں درسِ نظامی کا مکمل نظم اور تربیت کا معقول انتظام ہے۔
اس ادارہ نے جتنی جلدی اور حیرت انگیز ترقی کی ہے، اس منزل میں دوسرے اداروں کے پہونچنے میں ایک عرصہ لگا ہے۔ اللہ پاک ہر قسم کے شرور و فتن سے اس کی حفاظت فرمائے اور کارکنانِ مدرسہ کو اور زیادہ اخلاص کے ساتھ بڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(حضرت مولانا قاری) سیّد صدیق احمد (صاحب باندویؒ)
ناظم جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ
۴؍شوال ۱۴۱۲ھ

DARUL ULOOM AL-ISLAMIA
BASTI - 272 001 U.P. (INDIA)